

# ہم اور اقبال

مصنف

ڈاکٹر علی شریعتی

جاوید اقبال قبل باش ترجمہ

مصحح

ڈاکٹر سید علی رضا نقوی

ناشر

و فنر ٹھکانی قونصلر اسلامی جمہوریہ ایران اسلام آباد

کتاب کا نام: ہم اور اقبال

مصنف: ڈاکٹر علی شریعتی

مترجم: جاوید اقبال قرباش

مصحح: ڈاکٹر سید علی رضا نقوی

ناشر: دفتر ثقافتی و نصرت اخارت اسلامی جمہوریہ ایران - اسلام آباد

مطبع: نوبل پرنٹرز - راولپنڈی

سال اشاعت: ۱۴۱۳ھ / ۱۹۹۴ء

تعداد: ۱۰۰۰

قیمت: ۴۰ روپے

جدل حقوق محفوظ ہیں۔

## فہرست

### صفحہ

عنوان

مقدمہ (فارسی)

مقدمہ (اردو)

## ہم اور اقبال - حصہ اول

۲۱	دور حاضر میں مسلمان کا تشکیل اور اس کی تکالیف اور استفسارات
۲۲	میری بیسیوں صدی کے آلام
۲۵	پر اگنده اسلام اور منتشر علی
۲۹	عمارت کی تجدید

## ہم اور اقبال - حصہ دوم

۱۰۶	بیسیوں صدی
۱۲۱	جهان شناسی

jabir.abbas@yahoo.com  
www.Wajahat.com  
jabir.abbas@yahoo.com  
www.Sabeel-e-Bakra.com

## مقدمه

آسمان مشرق زمین، در سده اخیر، با بازگشت مصلحان، علماء و روشنفکرانی اصیل و متعهد به اسلام ناب، ستاره‌های درخشانی را به خود دید. درخشش این ستاره‌ها، خواب چند صد ساله استعمار کهن غرب را آشفته کرد و نهضت پیداری مسلمین را به دنبال داشت و راهی را برای مسلمانان گشود، که هنوز هم روندگان آن در مقابله با اقسام تهاجم‌های استعمار غرب، روز به روز بر استحکام خود می‌افزایند و امواج پیداری مسلمین، سواحل آمن غارت حکام و غفلت مغرب زمینیان را نیز تهدید می‌کند. چهره‌هایی در آفریقای مسلمان، خاورمیانه و شبه قاره هند و پاکستان در این آسمان درخشیدند و برخی برجستگی خاصی پیدا کردند که علامه اقبال، یکی از این چهره‌ها است.

نیم قرن پس از اقبال، از همین قیله مصلحان و پیدارگران اقالیم قبله، نوری درخشید که همه صدای خفته در گلوها را فریاد کرد و به آرمان‌های

بلند این مصلحان جامه عمل پوشاند.

### ستاره‌ای بدرخشید و ماه مجلس شد

بدر منور این آسمان، راست قامت همیشه تاریخ و شاه بیت این قصیده  
بلند، امام خمینی رضوان الله تعالی علیه بود که همچنان راه او در اقطار عالم،  
پیموده میشود.

بدون تردید علامه محمد اقبال، یکی از میوه‌های شجره طیبه اسلام در  
قرن معاصر است. او ستاره‌ای است در آسمان اندیشمندان و مصلحان  
صاحب درد که پیام و کلام اوریشه در اقیانوس مکتب وحی الهی دارد.

از آن نوری که از قرآن گرفتم سحر کردم صدوسی ساله سب را

اگرچه حدود شصت سال از افول جسمانی و ظاهری او می‌گذرد ولی  
اشراق و ظهور معنوی او هنوز در سپیده دم است، ظهوری که یکی از جلوه  
های ظهور مجدد اندیشه اسلامی و دینی در پایان هزاره دوم میلادی است.

ای بسا شاعر که بعد از مرگ زاد	جسم خود بر بست و چشم ما گشاد
رخت ناز از بیستی بیرون کشید	چون گل از حاک مزار خود دمید

او کسی است که افراد زیادی درباره او قلم زده اند و هر کدام از زاویه‌ای  
او را نگریسته‌اند. زیباترین و رساترین تعبیری که در این سال‌ها درباره علامه  
اقبال بیان شده است، تعبیر کسی است که "سالها مرید او بوده" و در زمانی هم  
که در مستند رئیس یک کشور بزرگ اسلامی درباره اقبال سخن گفته است، این  
ادایت را پنهان نکرده و امروز هم در کسوت رهبری انقلاب اسلامی، پیش‌تاز

نهضت پیداری مسلمین است. او اقبال را "ستاره بلند شرق"<sup>۱</sup> نامید و این لقب برای "اقبال"، جز بیان حقیقت، نیست.

دکتر شریعتی نیز یکی از مریدان و الهام‌گرفتگان از اقبال است. او اندیشه‌ها و احساسات اسلام خواهی و ندای "بازگشت به خویشتن" خود را در زمان حاکمیت ظلم و ظلمت در ام القرای امروز اسلام، فرا راه جویندگان حق فرارداد و بویژه زاویه نگاه او به اقبال، نکات آموزنده فراوانی دارد که امروز هم مورد نیاز و استفاده "اقبال دوستان" است. کتابی که بنام "ما و اقبال" پس از او منتشر شده حاوی دو دفتر است. دفتر اول سخنرانی دکتر شریعتی است در کنگره اقبال (در سال ۱۳۴۹ ش) که توسط حسینیه ارشاد در تهران برگزار شد و دفتر دوم، نوشته هائی است که گردآورندگان آثار او آن را بنام "ما و اقبال" در این کتاب، آورده اند.

ترجمه‌ای که پیش روی شما است، ترجمه همراه با تلخیص و تصرف دفتر اول و بخشی از دفتر دوم است که به اقبال و شناخت ابعاد اندیشه او مربوط می‌شود. بخش اعظم دفتر دوم در متن اصلی کتاب، که ترجمه نشده است، بیشتر به تحلیل جامعه شناسانه دین در جامعه آن روز ایران مربوط می‌شود و لذا برای مخاطبیان پاکستانی چندان مفهوم و قابل استفاده نمی‌باشد. در این تلخیص و تصرف، مطالبی که غالباً به عنوان موضوعات و جملات معتبره طولانی در میان مطالب کتاب آمده و یا تمثیل‌ها و شواهدی که بخصوص برای خواننده اردو زبان مفهوم نمی‌باشد و بویژه برای جوان یا نوجوانی که با تاریخ و جامعه و کنایات و اشارات ایرانی و فارسی متن، غریب است، حذف شده و اگرچه در همین محدودفات، نکات بدیع یا اشارات مفیدی برای اهل سخن و محققین اهل درد، وجود دارد، ولی هدف اصلی این ترجمه، آشنا

۱ - "اقبال، ستاره بلند شرق" موضوع سخنرانی حضرت آیة الله خامنه‌ای در کنگره بزرگداشت اقبال در تهران (سال ۱۹۸۶م) در زمان تصدی ریاست جمهوری اسلامی ایران ترجمه به اردو و انگلیسی چاپ ۱۹۹۴م لاهور ناشر اکادمی اقبال لاهور پاکستان با همکاری خانه فرهنگ جمهوری اسلامی ایران در لاهور.

شدن اقبال دوستان هموطن اقبال است با نگاهی که یکی از مریدان اقبال به مراد خود دارد. و حیف بود که با عدم تصرف و تلغیص متن، راه را برای بهره برداری "اقبال دوستان جوان" از این نوشته بیندیم.

در همین جا لازم است از جناب آقای جاوید اقبال قزلباش و جناب آقای دکتر علیرضا نقوی که زحمت ترجمه و تصحیح را بر عهده گرفتند، سپاسگزاری و تقدیر شود.

رایزنی فرهنگی و خانه های فرهنگ جمهوری اسلامی ایران در پاکستان به عنوان یک وظیفه، همواره یاد اقبال، آثار اقبال، افکار و اندیشه های اقبال را در سرزمین اقبال گرامی داشته و تلاش های مفیدی را با همکاری ایران دوستان و اقبال دوستان پاکستانی برای احیاء و گسترش اندیشه های اقبال، انجام داده اند. و اکنون که چهل مین سال انعقاد قرارداد رسمی فرهنگی بین دو کشور اسلامی پاکستان و ایران می باشد، این ترجمه را در اختیار ارادتمندان و دوستداران اقبال قرار می دهد. البته روابط طبیعی فرهنگی بین این دو خطه، سابقه ای چند هزار ساله دارد. نزدیکی و شیاهت و تبادل فرهنگی عمیق و ریشه دار بین دو ملت ایران و پاکستان، کمتر مورد مشاهی در سطح جهان دارد. نشر این کتاب به این مناسبت، بدین معنی است که ما همه اشتراکاتمان را می توانیم در "اقبال" خلاصه کنیم. اشتراک تاریخی، زبانی، فرهنگی، دینی و مهم تر از همه اشتراک قلمی و آرمانی بین دو ملت، در افکار عمیق و بلند علامه اقبال تبلور عینی یافته است. اقبال، سرمایه مشترک ما است و الهام بخش راهی که مسلمین را می توانند به شکوه و مجد بایسته خود برسانند. اقبال، نیاز امروز ما است و هنوز برای شناخت اقبال و شناساندن او باید تلاش ها کرد. آنهم نه از روی انجام یک وظیفه اداری و رسمی، که به عنوان یک تکلیف الهی، انسانی و ملی.

علی ذو علم  
رایزن و نماینده فرهنگی ج.ا.ا - پاکستان

## مقدمة

مشرق کی سر زمین کے آسمان پر موجود صدی میں خالص اسلام سے والبستہ اور اصلی مصلح، عالم اور روشن خیال افراد کی پہیاں کی صورت میں درخشنان ستارے نمودار ہوئے۔ ان ستاروں کی چمک دمک نے مغرب کے چند سو سالہ قدیم استعمار کے خوب کو پریشان کر دیا اور مسلمانوں کی بیداری کی تحریک کو چلایا اور مسلمانوں کے لئے راستہ ہوار کیا کہ آج بھی اس راہ پر چلنے والے مغربی استعمار کے مختلف جملوں کا مقابلہ کرتے وقت روز بہ روز اپنی ثابت قدمی کو مزید سمجھم تر کر رہے ہیں اور مسلمانوں کی بیداری کی امواج اہل زمین مغرب کے حکام اور غفلت کے ہاتھوں امن کی گارنگری کے ساحلوں کے لئے بھی خطرہ کا باعث بن گئی ہیں۔

مسلمان افریقہ، مشرق وسطیٰ اور بر صغیر ہندو پاکستان میں اس آسمان پر جو چہرے  
درخشنan ہوئے ان میں سے بعض چہروں نے خاص ممتاز مقام حاصل کر لیا کہ علامہ  
اقبال ان چہروں میں سے ایک ہیں۔

علامہ اقبال کے تقریباً نصف صدی بعد مسلمان ممالک کے مصلحین اور  
بیدار گروں کے اسی قبیلہ سے ایک نور پھونٹا جس نے خلق میں خوابیدہ ساری صداؤں  
کو ایک فریاد کی صورت بخشی اور ان مصلحین کے بلند مقاصد کو جامہ عمل ہبھایا۔  
ستارہ ای بدر خشید و ماہ مجلس شد  
(ایک ستارہ چکا اور محفل کا چاند بن گیا)۔

اس آسمان کا بدر منیر اور ستارہ نمیں ہمیشہ بلند قامت فرد اور اس عظیم قصیدہ  
کا شاہ بیت (اہم ترین شعر) امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ دنیا کے تمام گوشے و کنار  
میں لوگ بدستور حن کی راہ پر گامزن ہیں۔

بلائیک و تریڈ علامہ اقبال اس صدی کے اسلامی شجرہ طیبہ کے چھلوٹوں میں  
سے ہیں، وہ اہل درود مفکرین اور مصلحین کے آسمان کا ایک ستارہ ہیں جس کا سر چشمہ  
پیام اور کلام و قلبی کے کتب کا بحر اوقیانوس ہے  
اذ ان نوری کہ از قرآن گرفتم  
حر کردم صد وی سالہ شب را

(اس نور سے جو میں نے قرآن سے کسب کیا ایک سوتیس سالہ رات کو صحیح میں بدل  
دیا)۔

اگرچہ تقریباً سانچھ سال ہوئے کہ یہ ستارہ جسمانی اور ظاہری طور پر غروب ہو چکا ہے

لیکن اس کی تحلیل اور معنوی ظہور اب بھی سفیدی صبح میں جلوہ گر ہیں، ایسا ظہور جو دوسرے عیسوی ہزارہ کے اختتام پر اسلامی اور دینی فکر کے جدید ظہور کے جلووں میں سے ایک ہے۔

ایسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد چشم خود بر بست و چشم ما گشاد رخت باز از نیتی بیرون کشید چون گل از خاک مزار خود دمید (لکھنے ہی شاعر ایسے ہیں کہ اپنی وفات کے بعد انہوں نے اپنی آنکھیں تو موند لیں لیکن ہماری آنکھیں کھول دیں۔ انہوں نے عدم سے دوبارہ ظہور کیا اور پھول کی طرح اپنے مزار کی مٹی سے رو بنا ہوئے)۔

علامہ اقبال ایک ایسی شخصیت ہیں جن کے بارے میں متعدد اشخاص نے قلم اٹھایا ہے اور ہر ایک نے ایک خاص زاویہ نظر سے ان کو دیکھا ہے۔ ان چند سالوں میں علامہ اقبال کی حسین ترین اور جامع ترین تعریف اس عظیم شخص کی تعریف ہے "جو سالوں ان کے مرید رہے" اور اس وقت بھی جبکہ وہ ایک عظیم اسلامی مملکت کے سربراہ ہیں انہوں نے علامہ اقبال کے بارے میں بیان دیا ہے کہ ان سے اپنی عقیدت کو چھپایا نہیں ہے درحالاں کہ آج بھی وہ اسلامی انقلاب کے رہبر کے بیاس میں مسلمانوں کی بیداری کی تحریک کے پیشواؤں انہوں نے علامہ اقبال کو "مشرق کا بلند ستارہ" ① کہا ہے اور اقبال کے لئے یہ لقب حقیقت کے بیان کے سوا کچھ نہیں۔

۱۔ اقبال "ستارہ بلند مشرق" حضرت آیت اللہ خامسۃ ای کی تقریر کا عنوان ہے جو انہوں نے تہران میں علامہ اقبال کانفرنس (منعقدہ سال ۱۹۸۱ء) میں کی تھی جس وقت وہ ایران کی اسلامی گھبڑویہ کے صدر تھے۔ اس کا ردود افکار ایکریزی ترجمہ اقبال اکیڈمی پاکستان لاہور نے نایاب فرنگ اسلامی گھبڑویہ ایران لاہور کے تعاون سے ۱۹۹۳ء میں شائع کیا۔

ڈاکٹر شریعتی بھی ان اشخاص میں سے ایک ہیں جن کو علامہ اقبال سے والہا نہ عقیدت ہے اور جہنوں نے ان سے الہام حاصل کیا ہے اور اپنے اسلام طلبی کے افکار اور جزبات "خود کی طرف واپسی" کے نعرے کو آج کے اسلام کے ام القری (سب سے اہم شہر) میں ظلم اور تاریکی کی حاکیت کے زمانہ میں حق طبوں کے سامنے رکھا اور خاص طور سے اقبال کے بارے میں ان کا زاویہ نظر نہایت درس آمیز نکات کا حامل ہے جو آج بھی اقبال کے دوست داروں کے لئے ضروری اور قابل استفادہ ہیں "ما و اقبال" (ہم اور اقبال) نام کی کتاب جوان کی وفات کے بعد شائع ہوئی ، دو جلدیں میں ہے۔ پہلی جلد مشتمل ہے ڈاکٹر شریعتی کی تقدیر پر جو انہوں نے (۱۹۶۰ء میں) اقبال کا نفرنس میں کی تھی جو تہران میں "حسینیہ ارشاد" کے زیر اہتمام منعقد ہوئی تھی دوسری جلد مشتمل ہے ان تصنیفات پر جوان کی تصنیفات کے مرتبین نے ان کو اس کتاب میں "ما و اقبال" کے نام سے دے دیا ہے۔

یہ ترجمہ جو آپ کے پیش نظر ہے جلد اول اور دوسری جلد کے ایک حصہ کے خلاصہ کا ترجمہ ہے میں کچھ تصرفات کے جو علامہ اقبال اور ان کی افکار کے پہلوؤں کے تعارف سے متعلق ہے۔ جلد دوم کا بیشتر حصہ جو اصل کتاب کے متن میں موجود ہے لیکن یہاں اس کا ترجمہ نہیں کیا گیا اکثر عمرانیات کی رو سے دین اور اس وقت کے ایرانی معاشرہ کے تجزیہ سے متعلق ہے۔ لہذا وہ پاکستانی حضرات کے لئے چند اس قابل فہم اور قابل استفادہ نہیں ہے۔ اس تصرف شدہ خلاصہ میں بعض مضمونیں جو غالباً طولانی موضوعات اور مختصر سہ جملوں کے طور پر اصل کتاب کی عبارات کے درمیان میں آئے ہیں یا ایسی مثالوں اور شہادتوں کو جو خاص طور پر اردو زبان

قارئین کے لئے قابل فہم نہیں اور تاریخ، معاشرہ اور اصل کتاب کے متن میں آئے ہوئے ایرانی اور فارسی کنایات اور اشارات کو جو جوانوں یا نوجوانوں کے لئے نامانوس ہیں، حذف کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ حذف شدہ عبارات میں بعض نادر ثناکات یا مفید اشارات اہل سخن یا اہل درود محقق حضرات کے لئے موجود تھے لیکن اس ترجمہ کا اصل مقصد اقبال کے ہم وطن دوست داروں کو اس زاویہ نظر سے روشناس کرانا ہے جو اقبال کے میریوں میں سے ایک کا ہے جو خود بھی اقبال کا ہم وطن ہے لیکن یہ وطن جغرافیہ کے لحاظ سے نہیں بلکہ وہی وطن ہے جو اقبال کی نظر میں وطن ہے اور بڑی افسوسناک بات ہوتی اگر خلاصہ اور تصرف کے بغیر اقبال کے جوان دوست داروں کے لئے اس کتاب سے استفادہ کارستہ مسدود کر دیا جاتا۔

مہماں ضروری ہے کہ جناب جاوید اقبال قربیاش اور ڈاکٹر سید علی رضا تقی کا جہنوں نے اس کتاب کے ترجمہ اور تصحیح کی زحمت فرمائی شکریہ ادا کیا جائے اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔

000

پاکستان میں اسلامی جمہوریہ ایران کے ثقافتی و نصری کے دفتر اور ثقافتی مرکز نے اپنے ایک فرض کے طور پر ہمیشہ اقبال کی یاد، ان کی تصنیفات اور ان کی افکار کا اقبال کی سر زمین میں احترام روا رکھا ہے اور ایران اور اقبال کے پاکستانی دوستداروں کے تعاون سے اقبال کے افکار کے احیاء اور اشاعت کے لئے مفید کوششیں انجام دی ہیں اور اب پاکستان اور ایران کے دو مسلمان ملکوں کے درمیان

ثقافتی معاہدہ کے انعقاد کی چالیسویں سالگرہ کے موقع پر یہ ترجمہ اقبال " کے اراد تمندوں اور دوست داروں کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ البتہ ان دو خطوں کے درمیان تدریقی ثقافتی تعلقات کی تاریخ کئی ہزار سال پر محیط ہے ایران اور پاکستان کی دو قوموں کے درمیان عمیق اور گہری ثقافتی نزدیکی، مشاہدہ اور تبادلہ کی، دنیا کی سطح پر، کم تر مشاہدہ ملتی ہے۔ اس موقع پر اس کتاب کی اشاعت اس مقصد سے ہے کہ ہم اپنے تمام مشترک امور کی تعمیل علامہ اقبال " کی شخصیت میں کر سکتے ہیں۔ ہمارا تاریخی، انسانی، ثقافتی، دینی اور سب سے اہم دو قوموں کا قلبی اور نصب الحین اشتراک علامہ اقبال " کی عمیق اور بلند افکار میں عین طور پر جلوہ گر ہوئے ہیں۔ اقبال ہمارا مشترک سرمایہ ہیں اور وہ ہیام بخش راہ ہیں جس کے ذریعہ مسلمانوں کو ان کے لائق شان و شکوه عظمت تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔

علامہ اقبال " ہماری آج کی ضرورت ہیں اور ہمیں چاہیے آج بھی اقبال " اور ان کے تعارف کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں، شاکیں دفتری اور سرکاری فرض کی انجام دہی کے طور پر، بلکہ ایک خداوی، انسانی اور ملی فرض کے طور پر۔

علی ذو علم

ثقافتی تونسلر و میادن

اسلامی جمہوریہ ایران در پاکستان

پہلا حصہ

ہم اور اقبال

jabir.abbas@yahoo.com

jabir.abbas@yahoo.com  
jabir.abbas@yahoo.com

جب ہم کسی ایسے بڑے انسان سے متعارف ہوں جس نے کامیاب زندگی گواری ہو، تو اسکی روح کو اپنے جسم میں بسائیتے ہیں اور اس کے ساتھ جیتے ہیں اور یہ عمل ہمیں زندگی بخشتا ہے۔

(شاندل "سبر کتابخانے")

اس بہت قیمتی اور مفید پروگرام کے ذریعے، جو حسینیہ ارشاد کے تحقیقی اور تبلیغی ادارے کی کاوش سے ہمارا معتقد ہو رہا ہے، شاید ہم ہمہ بار اس جدید دور میں عالمی سطح پر بین الاقوامی اسلامی فکر اور بصیرت کے ساتھ ایک اعلیٰ اور تحقیقی کام کر رہے ہیں اور یہ بات خود اس احساس کی علامت ہے جس کا علامہ اقبال ہمارے دور میں مظہر رہے ہیں۔

اسلامی معاشرہ اپنے اس جمود اور تعطل کے دور میں اپنے ٹنگ قومی اور بند مقامی شکلوں کے اندر بند ہو کر رہ گیا ہے اور اسلام کی عالمی بصیرت اور تصور کائنات فراموش ہو چکا ہے وہ وحدت جو اسلام نے آفیقی طرز فکر کی بنیاد پر قائم کی تھی

اور جو کسی بھی خاص قومیت اور سر زمین تک محدود نہیں تھی پارہ پارہ ہو گئی ہے اور بد قسمتی سے مسلمان ساری دنیا سے کٹ چکے ہیں اور روایات، تاریخ اور گوناگوں جاہلیت کے عناصر سے مخلوط مذاہب اور غیر اسلامی افکار اور اسلام کے سُن شدہ عقاید کے محدود دائرے میں محصور اور محبوس ہو کر رہ گئے ہیں لیکن آج اس قسم کے پروگرام اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اسلامی معاشرے کے روشن فکر حضرات محدث ایران کے اس مرحلے تک پہنچ گئے ہیں کہ وہ ان محدود دائروں کو جسے زمانے نے ان کے عظیم انسانی اور فکری وجود کے گرد اگر دنیا یا ہے توڑ دیں، اور پھر یہ کوشش بھی کر رہے ہیں کہ پرانگندہ اور مستشرق جسم دوبارہ ہبہ جائے اور وہ مکمل وحدت اور وہ "اسلامی کلیت" جس کی تماستی کے علاوہ اسلام ہرگز زندہ صورت میں جسم نہیں ہو سکتا دوبارہ تحریر کر دی جائے۔ یہ "تحریر نو" بالکل وہی اصطلاح ہے جسے علامہ محمد اقبال نے اپنی عظیم تصنیف "اسلام میں مذہبی طرز فکر کی تحریر نو" میں اپنا موضوع قرار دیا ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ یہ ہماری اسلامی تحقیقات اور معنوی، فکری، علمی اور اسلام شناسی کی کوششوں کے سلسلے میں ایک نئے دور کا آغاز ہو گا اور اس سے بھی زیادہ عمیق مکمل اور مفید پروگرام ہمارے سامنے آئیں گے۔

خاص طور پر میری یہ آرزو ہے کہ سب سے پہلے اس شخصیت کے متعلق جس نے دنیا کے مسلمانوں کے نیم مردہ جسم میں نئی روح پھونک دی یعنی سید جمال الدین اسد آبادی کی یاد میں الیسا ہی پروگرام تیار کریں اور جلسہ منعقد کریں۔ وہ شخصیت جس نے خوابیدہ مشرق میں بیداری کے لئے ہبھلی آواز بلند کی اور مشکوک خیالات اور آلوہ ہاتھوں والے جس کے سایہ تک سے ڈرتے ہیں ہمہاں تک کہ آج تک اسکی یادگار پر بھی حملہ آور ہوتے ہیں۔ کسی ہفتہ مل بیٹھیں اور اس شخص اور

اسکے اثرات پر بحث کریں اور اسے ہبھانیں جس نے نہ صرف اسلامی اور ایرانی معاشرے بلکہ زنجیروں میں جگڑی ہوئی دوسری اقوام اور بقول "فراتر فانون" روئے زمین کے تمام مغضوب انسانوں کو مستاثر کیا ہے میں نہیں چاہتا کہ صرف اسکی تعظیم و تجلیل کریں۔ لیقیناً سید جمال الدین اور اقبال جیسے انسانوں کو ہبھاتنا ایک فرد کی شخصیت کو ہبھاتنا نہیں ہے بلکہ ایک مکتب لکر اور ایک نظریہ اور ہمارے لپٹے مخصوص حالات اور احوال کا ہبھاتنا ہے۔ اقبال ایک "باب" کا عنوان ہے اقبال یا سید جمال الدین کو ہبھانے سے ہم ایک الیے "من" میں پہنچ جاتے ہیں جس کا عنوان یہ شخصیات ہیں اس کا "من" خود ہم، ہماری فکر، ہماری مشکلات اور ہماری مشکلات کے حل کرنے کے طریقے ہیں۔ اسی سے سید جمال الدین اور اقبال کی شاخت خود اسلام اور مسلمانوں کی شاخت اور ہمارے زماں حال و آئندہ کی ہبھان ہے۔

### دور حاضر میں مسلمان کا تشخص اور اسکی تکالیف اور استفسارات

میں ان ہزاروں افراد میں سے ایک فرد کے طور پر جو اس ملک اور وقت کے اس دور میں کھڑے، اپنی تقدیر، اپنے مستقبل اور دنیا کے موجودہ حالات اور اپنی کیفیت پر غور کرتے ہیں اور تاجر کسی راہ حل اور نجات کی جستجو میں ہیں۔ میں ایسے افراد کی زبان میں بات کرتا ہوں۔ میں خود ان ہی میں سے ایک ہوں اور چاہتا ہوں کہ ان لوگوں سے جن میں میری طرح کا درد ہے عرض کروں کہ اقبال ایک علامت ہے ہماری اس بخبر سر زمین اور ہمارے اس دور کے پرآشوب اور طوفانی صحراء میں جہاں ایک پیاسا پر تجسس مفکر جس مکتب اور مذہب کی طرف بھی رخ کرتا ہے اور جس راہ حل اور فکر اور عنصر کی طرف رجوع کرتا ہے سیراب نہیں ہوتا ہے، اور

اگر راہ حل درست بھی ہو اور مطلوبہ نتائج تک بھی پہنچ جائے، تب بھی وہ اسکے تمام دردوس اور ضرورتوں کے سلے کافی نہیں ہوتا، اس لئے کہ میں ایک خاص مخلوق کے اعتبار سے اس موجودہ زمانے میں ایک نسل کے طور پر صرف اپنے ملک، اپنے معاشرے اور اپنی تاریخ کی حدود میں نہیں بھی رہا ہوں۔

میں ایک طرف تو بیوی صدی سے والست ہوں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بیوی صدی میں نہیں بھی رہا۔ بیوی صدی کے آلام، مشکلات، اور واقعات نے مجھے، میرے جذبات، میری تقدیر اور معاشرے کو متاثر کیا ہے۔ صنعت، علم، جبر، ترقی، انقلاب اور وجود و عدم وجود جس کا نام مغربی تدن رکھا گیا ہے ان کے گروں ذیل دیو کے مقابل سینہ تانے کھرا ہوں اور مجھے اس عظیم طوفان اور ان سب رنگارنگیوں اور اچھے بے مناظر کے سامنے جو سب مل جل گئے ہیں، اپنے مقام کا تعین کرنا ہے۔

دوسری طرف میں ایک انسان ہوں اور مجھے جاتا ہے کہ اس فطرت اور بڑی کاتمات میں ایک انسانی وجود کی حیثیت سے میرا کیا کام ہے۔ مجھے کس طرح سے زندگی گذاری چلے ہے اور میری تقدیر اور داستان کیا رہی ہے اور میری فطرت کیا ہے۔ میں کس واسطے آیا ہوں، مجھے کس لئے جیسا چلے ہے اور خلقت، روح اور اس تدبیر کے، جو خلقت پر مسلط ہے، کیا صحنی ہیں؟ میں کس چیز پر اعتماد رکھوں اور زندگی، ہستی اور اپنے معاشرے اور زمانے کے اور خود اپنے بال مقابل میری فکر کی بنیاد کیا ہوئی چلے ہیے۔

دوسری طرف میں زین کے ایک الیے خلے سے والست ہوں جس کا نام مشرق ہے جس کا ماضی، حال اور مستقبل تینوں نکرانگیں، وسوسہ انگیں، اور درد اور

ہیں۔

اسی طرح میں ایک ایسے معاشرے اور امت سے وابستہ ہوں، جو اسلامی کہلاتا ہے۔ میری فطرت و تقدیر و جذبات اور تربیت اس ملت سے منسلک ہیں، اور یہ امت ایک ایسی حالت میں ہے اور ایسے عوامل کے سبب تکلیف اٹھا رہی ہے کہ میں اس کے مقابل بھی الامم نہیں رہ سکتا۔ میں نہیں جانتا کہ لپٹنے احساس کو کس بنیاد پر استوار کروں اور کس فلسفے کی بنیاد پر دنیا کو دیکھوں اور کس چیز پر اعتماد کھوں؟

یہ تمام سوالات بغیر جواب کے رہ گئے ہیں۔

ساتھ جوان سوالوں کا جواب دینے کی مددی ہے، وہ بھی آج، خصوصاً مشین زدگی صنعتی بورڑوایت اور تجارتی ثقافت کے بعد ایک بندگی میں پہنچ گئی ہے اور موجودہ نسل اور سہاں تک کہ دانشوروں کا بھی اس پر ایمان متزلزل ہو گیا ہے۔

یہ ہیں میری پریشانیاں اس ہستی میں ایک انسانی وجود کی حیثیت سے اس دنیائے فطرت میں میں نہیں جانتا، میں کس چیز پر اعتماد کھوں اور کس چیز پر اعتماد نہ رکھوں؟ مندرجے کے حل کی راہ کو نہیں ہے، ہستی کی کلی حقیقت کیا ہے؟ فطرت کا کوئی نصب الحین ہے یا نہیں؟

### میری بیویں صدی کے آلام

ایک طرف تمام پریشانیاں جو بیویں صدی کے انسان کو اور ممتدن بشر کو آج درپیش ہیں، مجھے بھی درپیش ہیں، اگرچہ میں ایک مشرق انسان اس جدید ممتدن سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہا اور اسکے فیوض سے مستفید نہیں ہو رہا، لیکن اس کے تمام اخراجات، مصروفتوں، امراض اور بد بخیوں سے مجھے بھی حصہ مل رہا ہے۔ سہاں تک کہ خود آج کے ایک ممتدن یورپی فرو سے بھی زیادہ!

ابھی ہم بیکنالوچی کی حکومت تک بھی نہیں پہنچے ہیں، افسر شاہی دور میں بھی داخل نہیں ہو پائے، میں زدگی اور سرمایہ داری کے دور تک بھی نہیں پہنچے۔ لیکن ان تمام پریشانیوں اور بیماریوں کو جو اس دور میں مغرب سے مخصوص ہیں، اپنے تمام تر وجود اور سارے حواس کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ مشرقی ہونے کے مخصوص نتائج اور الیے اور ان جدید نظاموں کے مقابلے میں میرے مادی اور معنوی حملوں کے شکار ہونے کے علاوہ ہیں۔ اس لئے کہ ان حالات میں، میں ایک مشرقی انسان، بیویں صدی کی تمام پریشانیوں اور دکھوں کو جدید تدن کے مادی اور روحانی مظاہر کے ہمراہ اپنے اندر محسوس کرتا ہوں۔

مجھے ایک پہنچاندہ معاشرے کی تکالیف اور پریشانیاں مٹا بھوک، جہل، بد بختی کو بھی محسوس کرنا چاہیے، یعنی میں دو ادوار کے درمیان کھدا ہوں اور ان دونوں ادوار کے متناقض دکھوں کو اپنے وجود کے اندر پاتا ہوں۔

مجھے ایک غیر متمدن انسان کی طرح پہنچاندگی اور انحطاط اور مادی کمزوری، ثقافتی افلاس، جہالت اور ایک ایسے انسان کی طرح جو مشین، صنعت و طاقت اور سائنس کے دور سے وابستہ ہو، فکری انتشار، تاریکی، روحانی بیماریوں، فلسفیانہ بایو سیوں، تہنائی اور بیویں صدی اور جدید ترقی یافتہ تدن کے سب انحطاطات، اخرافات اور بد عنوانیوں کا رنج بھی سہتا ہے۔

میں کیا کروں؟ کون ہے جو ان سو الوں کا جواب دے؟ وہ شخص جو آگاہ بھی ہو اور درد مند بھی اور ذمہ دار بھی ہو اور ساتھ ساتھ مسلمان اور مشرقی بھی ہو۔

بادوجود اس کے کہ میں ہے شیخ سید جمال الدینؒ کو تحریک اسلامی کے عظیم ترین بانیوں میں سے بھتتا ہوں، لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے یقین ہے کہ سید جمال الدینؒ کی عظیم، تعمیری اور آغاز کننده تحریک اپنے ارتقا، کے راست پر چلتی ہوئی علامہ اقبالؒ تک پہنچی ہے اور علامہ اقبالؒ نہ صرف اپنے افکار سے بلکہ اپنی شخصیت سے بھی

میرے ان تمام سوالوں کا جواب دے سکتے ہیں۔ وہ بات جو مجھے اپنی گفتگو کے آخر میں کہنی چاہیے تھی، میں اسے ابتداء ہی میں کہہ رہا ہوں۔

جب میں اقبال کے متعلق سوچتا ہوں تو میں ایک علی صفت شخص کو دیکھتا ہوں ایک الیے انسان کو علی کے طرز پر لیکن بیویں صدی کے متناسب کمیتی و کیفیتی اندازوں اور بشری صلاحیتوں کے مطابق کیوں؟ اس لئے کہ علی وہ ذات ہیں کہ نہ صرف اپنی لکر اور کلام بلکہ لپٹے وجود اور زندگی سے تمام زمانوں میں بشر کے سارے دکھوں ضروریات اور ہر قسم کی احتیاجات کو رفع کرتے ہیں۔

### پر اگنده اسلام اور منتشر علی:

لیکن یہ علی یہ اسلام، تمام تاریخ کے تسلسل میں مختلف عوامل کے اثر سے، جن کی تشریع کا یہ موقع نہیں، منتشر ہو گئے اسلام ختم نہیں ہوا، علی بھی ختم نہیں ہوئے مکتب اسلام بھی موجود ہے۔ مگر جس چیز نے مکتب اسلام کی اس انقلابی طاقت اور حیاتی جوش و خروش کو اس سے چھین لیا ہے، وہ پہیکر اسلامی کا بکھر جانا ہے، کہ اس کا ختم ہو جانا!، تاریخ میں بہلی بار اسلام ایک ایسا مکتب تھا کہ جس نے مذہبی احساس اور مذہب کی مسخرہ آسا طاقت کو، جو ہمیشہ فرد کے میلان بہ درون اور اس کی ذہنیت میں جسم، ہوتی اور تزکیہ نفیں اور عالی انسانوں کی تعمیر کرتی تھی "آسمان سے زمین پر لے آیا" ۱ اور اس عظیم اندر رونی معنوی طاقت اور میلان بہ فرد کو ایک

۱۔ یہ سترزاد کا فتح کے متعلق قول ہے۔ جس میں اس نے لہا ہے "میں فتح کو آسمان سے زمین پر اندر لایا ہوں" اسلام نے مذہب کے ساتھ ایسا یہ کیا ہے۔

خارجی اور معاشرتی احترام بھی بخشا ہے اور جامدہ بشری کی تعمیر، نظری رہنمائی اور اس دنیا کی زندگی کی راہ میں انسانی معاشرہ کو استعمال کیا۔

رہبری یہ نہیں ہے کہ اخلاقی رہنمائی کو میخ کے ہاتھ میں دے دیں اور سب سی رہنمائی کو قبیر کے حوالے کر دیں۔

زندگی یہ نہیں کہ آخرت کی زندگی کو دین کی بنیاد اور دُنیوی زندگی کو تعلق کی بنیاد پر استوار کر دیں۔ اور انسان یہ نہیں کہ اس کے میلان بہ درون کو عشق اور ایمان اور اس کے میلان بہ بیرون کو مادیت اور سائنس سے تعمیر کر دیں، بغیر عالمی توجیہ اور بغیر جہان شناسی کی بنیاد (فراتم کئے)۔

اسلام نے اپنے انفرادی اور معاشرتی، مادی و معنوی مکتب کی بنیاد تو حیدر پر رکھی ہے اور جیسے کہ میں نے کہا ہے، تو حیدر صرف اپنے فلسفیات اور کلامی حصار میں، جیسے کہ تاریخ اور مفکروں اور علماء کے ذہنوں میں ہمیشہ موجود رہا ہے، مخصوص و محدود نہیں ہے۔ تو حیدر، وحدت ذات خدا کے معنوں میں دنیاوی، مادی اور انسانی انعکاسات اور منطقی التزامات رکھتی ہے۔

تو حیدر پر اعتقاد ایک ہی وقت میں وحدت انسانی اور اسی طرح انسان کی طبقائی وحدت کی بنیاد نہیں ہستی میں ایک عام وحدت کی تعمیر کے معنوں میں ہے جس میں انسان فطرت کے راستے پر ارتقاء پیدا کرتا ہے۔

یہ ہیں تو حیدر اسلامی کے معنی اور یہ نہ صرف فلسفے اور مذہب کی بنیاد ہے، بلکہ فلسفے، تاریخ، عمرانیات اور علم حیات بشری کی بھی بنیاد ہے۔ (تو حیدر کے چار ہبلو: جہان شناسی، تاریخ، معاشرہ اور انسان ملاحظہ، ہو: "اسلام شناسی کے دروس" (مطبوعہ ارشاد)

اس "تو حیدی دین" میں علی اور وہ تمام بزرگ شخصیات جنہوں نے خالصہ اور  
برہ راست پیغمبر اسلام اور مکتب اسلام سے تربیت حاصل کی ہے، ایسی ہی ہیں۔  
یہ شخصیات دو ہم لو رکھتی ہیں۔ یہ وہ شخصیات ہیں جو بالکل علی کی طرح، وہ  
مرد جو مختلف حالات اور اندر وونی جذبات کے دوران ہستی سے فارغ ایک روح کی یاد  
دلاتا ہے اور اپنی معنوی مراجعوں میں "آسمان کے راستوں کو زمین کے راستوں سے  
بہتر پہچانتا ہے"، ہیں۔

ایسی روح جس کو رات سے جس تک نیند نہیں آتی اس خیال سے کہ "اسلامی  
محاشرے کے کسی دور افتادہ گوشے میں کوئی انسان بھوکا نہ سو گیا ہو"۔ ایک ایسی  
روح ہے جو کہ محاشرے میں بھوک کے مسئلے، یہاں تک کہ روئے زمین کے کسی  
 حصہ پر ایک فرد کی بھوک کے سلسلے میں اتنا حساس ہے، بالکل ایک عوام دوست  
 مادی رہبر کی طرح ہے جو لوگوں کی مادی زندگی کی حقیقت و اصلیت کے علاوہ کچھ  
 نہیں سوچتا۔

اس کا دوسرا ہم لو ایک ایسے حکیم کا ہے جس کو خلوت و سکوت اور باطن نے  
 جلا ڈالا ہے کہ گویا وہ اس سارے عالم کے بارے میں نہیں سوچتا۔

یہ "جو صاحب شمشیر و عن، اہل عشق و تکرہ ایسا مرد ہے جس کی تواریخ  
 سے موت برستی ہے۔ اور زبان سے وحی"۔ یہ شخص ایک مثالی انسان کا ایک نمونہ  
 ہے۔ یہ عظیم اصحاب، انسانی تہونے اور مثالیں ہیں، جو پیغمبر (ص) اور ان کا مکتب  
 تاریخ، بشر، انسان اور امت اسلامی کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ وہ خود کو اس

طرح سے تعمیر کریں ۔ یعنی "کامل انسان" اس قسم کے انسانوں کے نمونے ہیں جنہیں "عمرانیات" (کی اصطلاح) میں (انسان کامل) (L.Homme Total)

کہتے ہیں ، یعنی وہ انسان جو وہ تمام مکمل پہلو رکھتا ہے جو مثالی انسان میں ہوتے ہیں

امام کے ایک معنی یہ ہیں: عالی مثال اور انسان نمونہ ۔

علیٰ کی یہ شخصیت اور یہ اسلامی مکتب باقی رہ گیا لیکن منتشر حالت میں باکل ایسے ہی جیسے میں تو رہ جاؤں ، مگر میرا ہاتھ ایک جگہ سے کانا جائے ، اور پاؤں دوسری جگہ سے ، اور میرے سر اور آنکھ کو کہیں اور سے ، اور دل کو کہیں سے اور دماغ کو کہیں اور سے میں کامل طور سے تو موجود ہوں ختم نہیں ہوا ہوں سہماں تک کہ میری تعظیم و تقدیس کی جاتی ہے اور ممکن ہے مبالغہ آمیز حد تک بھی ایسا ہو لیکن بھی میں زندگی اور حرکت تو نہیں ہو سکتی ۔ (ان معنی میں) میں زندہ نہیں ہوں ।

علیٰ کے اس عرفانی پہلو نے ایک نہایت شفاف بلند اور گہرے تصوف اور تاریخ اسلام میں بہت پختہ اور لطیف انسانی عرفان کے طور پر ترقی کی ہے ۔ ①

علیٰ کے ایک ہمیرو ہونے کے پہلو نے معاشرے کے ایک اور طبقے میں عیحدہ طور پر جوانمردی ، بہادری اور پہلوانی کے تجسم ، تخلی اور مثال و علامت کی حیثیت سے عرفانی پہلو سے تعلق کے بغیر ترقی کی ہے ۔

ان کی حکمت و علم قرآن شاسی کے پہلو نے تفسیر ، اسلام شناسی ، حدیث شناسی کے ذریعہ اور سرچشمہ کی حیثیت سے اسلامی علوم کی بنیاد کے طور پر ترقی کی ہے

۱- مجھے ان غلط فائدوں سے جوان سے لئے جاتے ، سروکلا نہیں ۔ ہر کتب میں غلط فائدے اٹھاتے جاتے ہیں ۔

ان کی فکر کے مہلو نے تفکر و علم کے مظہر کے عروان سے ترقی کی ہے۔ ان کے سیاسی مہلو نے انصاف پسندی حق جوئی اور حقیقت کے تاریخ میں ستم رسیدہ عوام کی نکاؤں میں خدا نے عدل و حق اور سرحد الوبیت تک ترقی کر لی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ علیٰ باقی رہ گئے ہیں مگر نکڑے نکڑے ہو کر۔ اسلام رہ گیا ہے مگر جزو جزو، ہو کر۔ یہی بات ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کا وجود ہے اور مکتب اسلام کی تربیت یافتہ منتخب اور بر جستہ شخصیات ہماری ثقافت اور ہماری شاخست میں موجود ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک کو ایک خاص زاویہ نکاہ سے دیکھا جاتا ہے ہر ایک نکڑے نکڑے ہو چکی ہیں اور ان کے نکاؤں میں سے ہر ایک کی دوسرے نکاؤں سے جدا اصلی حیثیت حاصل ہو کر تعظیم کی جاتی ہے۔

### عمارت کی تجدید

عمارت کی تجدید کے معنی یہ ہیں کہ ہم واپس جائیں اور جستجو کریں ہماری اپنی ثقافت اور ان تمام ماحانی اور علوم میں جو موجود ہیں اور تمام اسناد، تاریخ، تذکرہ اور اس فکر اور ان شخصیات کی شاخست کے عوامل اور عناصر میں تلاش کریں اور بنیادی عناصر کو ڈھونڈیں اور اصلی و خالص انسان بخوبی کے مہلوں کو، جو تربیت شدہ شخصیات کے اندر حقیقی اور مطلق صورت میں شکر مثال اور قدیم قصور اور افسانوی کرداروں کی طرح موجود ہیں، ہمچنان لیں اور ان شخصیتوں اور اس عظیم مکتب کی تعمیر نو کریں یعنی ایک بار پھر مثالی انسان بنائیں اور اس ادھ بکھری کتاب کی، جس کا ہر باب اور ہر ورق کسی کے ہاتھ میں ہے شیرازہ بندی کریں اور از سر نو پہلے

کی طرح تదین کریں کیونکہ ایک فکر، ایک صحیح روح ایک سالم پیکر اور ایک واقعی کامل وجود کے اندر ہوتی ہیں، لیکن اگر ہم عناصر کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیں ایسے کہ ان کی اصل غائب ہو جائے اور کتنا بھی ان عناصر اور ایک دوسرے سے جدا شدہ اعضاء کی تعظیم کریں اور کتنا بھی ان جدا شدہ بدنوں کو ترقی اور ارتقاء کی منزلیں طے کرائیں، بالآخر ان کی وہ روح تو ختم اور وہ ان کی شخصیت فنا ہو چکی ہے اس جسم کی پوری طرح تعمیر نو سے روح پیدا ہوتی ہے۔

یہ روح کب اپنی اول صورت اختیار کرتی ہے۔ وہ صورت جس نے ایک چوتھائی صدی کے اندر انسان کو بربست اور وحشی پن سے نہال کر تمدن ساز انسان، دنیا میں نئی تاریخ کو بنانے والا اور تاریخ کے دھارے کو بدل دینے والا جس نے جب تاریخ جو شروع ہو چکا تھا بدل کر رکھ دیا اور اس کو بنادیا، یہ مکتب کب دوبارہ ایک نیم وحشی اور غیر تعلیم یافتہ عرب جنوب بن جتادہ کو جو نہ صرف دنیا کی کوئی خبر نہیں رکھتا، بلکہ اپنے ملک تک کی بھی خبر نہیں رکھتا، ابوزر غفاری کی صورت میں ڈھال سکتا ہے، وہ مرد جو آج بھی انسان کی سعادت کی تحریک کے لئے ایک زندہ اور الہام بخش شخصیت ہے اور محروم لئے ہوئے بدھال عوام کے لئے ایک امید کی کرن ہے۔

جس وقت اس بدن اور قرون وسطی کی تمام سیاہ تاریخ میں اس پارہ پارہ شدہ جسم کی دوبارہ شیرازہ بندی اور تجدید کریں، تاکہ یہ روح اپنے اس کامل اور صحیح بدن میں لوٹ آئے اور ایک بار پھر یہ موجودہ مخدودہ مادہ اس روح القدس میں تبدیل ہو جائے جو صور اسرافیل کی طرح بیویں صدی میں مردہ معاشروں میں پھونک دی

جائے اور ان سب حرکات کو دوبارہ پیدا کر دے اور دنیا میں وہ سب طاقت روح اور معنی کو وجود میں لے آئے۔ مثالی مسلمان انسان کی شخصیت کی یہ تجدید حیات، بنیاد کی تعمیر نو اور بکھرے ہوئے اور ایک دوسرے سے دور بنیادی عناصر کی شیرازہ بندی اور جم جم آوری بیسیویں صدی میں ایک نئے بدن میں جلوہ گر ہوتی ہے، یہ نئی تعمیر شدہ الیٰ ہوئی شخصیت محمد اقبال کی ہے۔

علامہ محمد اقبال ایک مسلمان عارف نہیں ہیں جو عزالتی کی طرح یا محی الدین عربی کی ماتنہ اور حجت (مولانا جلال الدین رومی) مولوی کی طرح جو صرف اور صرف ان ماورائی عرفانی حالات میں غور فکر کرے اور اپنے اس انفرادی ارتقاء، ترقیہ نفس اور اپنے روشن فہریت میں، اور اپنی طرح کے چند دیگر افراد سے بناتے رکھے اور باہر سے غافل رہے اور مخلوقوں کے حلقے، حکومت کے جبرا و استبداد اور لوگوں کے غلام بناتے جانے سے آگاہ نہ ہو۔ نہ ابو مسلم اور حسن صباح اور صلاح الدین ایوبی اور ان کی ماتنہ شخصیات کی طرح ہیں کہ تاریخ اسلام میں صرف مردم شناسی و طاقت و جنگ و سبب رزہ ہو اور فکر کی اصلاح اور تغیر و انقلاب اور معاشرتی روابط اور انسانی طاقت اور زور کے استعمال اور دشمن پر تسلط کو کافی سمجھے اور نہ ان سر سید احمد خان ہندوستانی کی طرح کے علماء کی ماتنہ ہے جو یہ سمجھتا ہو کہ اسلامی معاشرے اور قرآنی آیات خواہ کسی حال میں بھی ہو (اگرچہ انگریز والسرائے کے زیر تسلط ہو) ایک آج کل کی عالمانہ تفسیر اور اسلامی عقائد کی بیسیویں صدی کی سائنسی اور منطقی تاویلیات سے اور گہری عالمانہ تحقیقات اور فلسفیات غور خوض کے ذریعہ اسلام کو زندہ کیا جاسکتا ہے۔

اقبال ایسے انسان ہیں جو بیک وقت نہ تو مغرب کی طرح سائنس کو انسانی ارتقاء اور اس کے دکھوں کے مدارا کے لئے کافی سمجھتے ہیں اور نہ ہی کسی ایسے فلسفی کی طرح ہیں کہ جو اقتصاد اور اقتصادی ضروریات کے حصول کو انسان کی تمام ضروریات کا حصول بتاتے ہوں اور نہ ہی لپٹنے ہم وطنوں یعنی ہندوستان کے بڑے مفکروں اور بودھ مذہب والوں کی طرح ہیز کہ باطن کے صفا اور اس "سامسارا" زندگی اور اس چکر سے روح کو نجات دے کر نیر و انا کو انسان کے مشن کا انجمام سمجھتے ہوں اور یہ خیال کریں کہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں بھوک، غلامی، کمزوری اور ڈلت ہو، وہاں پاک اور بلند مرتبہ روحیں اور تربیت شدہ اور سعادت مند انسان حتیٰ کہ ترکیہ شدہ اخلاق بنائے جاسکتے ہیں۔

نہیں، اقبال لپٹنے مکتب اور بنیادی طور پر اپنی ہستی سے یہ دکھاتے ہیں کہ جس فکر سے وہ وابستہ ہے، یعنی اسلام، وہ ایک ایسی فکر ہے کہ ایک طرف وہ دنیا اور انسان کی مادی ضروریات کی طرف پوری توجہ دیتا ہے پھر انسانوں کو الیسا دل بخش دیتا ہے کہ بقول انہی کی:

”زندگی کے خوبصورت ترین حالات کو اوقات سحرگاہی کے ذوق اور غور و فکر میں دیکھتا ہے“

وہ قطعی طور پر ایک عارف ہیں جو شفاف اور مادہ سے مبڑا روح کے مالک ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک ایسے انسان ہیں جو ہمارے زمانے میں تکنیک اور انسانی تعلق کی ترقی کو تعظیم و احترام کی لگاہ سے دیکھتا ہے۔

علامہ اقبال ایسے اشرفتی اور جذباتی نہیں ہیں کہ ”تصوف اور مسیحیت“ اور

”لائٹر“ اور ”بودھ اور جین“ کے مذاہب کی طرح سائنس کی تحقیر کرے یا عقل اور سائنسی ترقی کی تزلیل کرے ۔ چنانچہ وہ خشک سائنس کا بھی قائل نہیں کہ ”فرانس بیکن“ اور ”کلاؤبرنارڈ“ کی طرح صرف مظاہر کے روابط اور مادی گواہر کے پتہ چلانے اور قدرتی طاقتون کو مادی زندگی کے خدمت گزار بنانے کے حصار میں رہے اور یہیک وقت وہ ایسا مفکر بھی نہیں ہے کہ فلسفے، اشراق، سائنس، دین، عقل اور وہی کو باہم جمع کرتا اور جوڑتا ہو جیسے دارالشکوہ اور بعض دوسروں نے ہبہ غیر مناسب طرح سے اس کام کو انجام دیا۔ بلکہ وہ دنیا کے متعلق اپنی نگاہ اور بصیرت میں تعقل کو اور سائنس کو اپنی معنوں میں جن میں آج کی دنیا میں وہ مروج ہیں، نہ اسی ہدف کے ساتھ عشق، جذب اور الہام کا ہم کار، ہمراہ اور ہم قدم سمجھتا ہے اور نہ انسانی روح کے ارتقاء کی راہ میں ان دونوں کو باہم مل کر کام کرنے والا سمجھتا ہے۔

علامہ اقبال کا انسانیت کے لئے عظیم ترین اعلان یہ ہے کہ ”عیسیٰ (ع) کی مانند دل رکھئے، سقراط کی طرح فکر اور تیھر کے مانند ہائھ۔ مگر ایک واحد انسان، ایک بشری وجود کے اندر، ایک روح کی بنیاد پر، اور نصب الحین تک ہیچنے کے لئے یعنی اقبال خود، وہ انسان جو زمانے کی سیاسی بیداری کو لپنے عروج پر رکھتے تھے، (اس طرح کہ بعض لوگ انہیں فقط ایک سیاسی شخصیت اور قوی آزادی کے رہبر اور بیویں صدی میں استعمار کا مخالف سمجھتے ہیں)، اور فلسفیانہ اور سائنسی تفکر میں وہ اس سطح پر ہیچنچ ہونے تھے کہ آج مغرب میں انہیں ”برگسان“ کے درجہ کا ایک ہم عصر مفکر اور فلسفی اور تاریخ اسلام میں ”عزالی“ کی صفت میں سمجھتے ہیں، ساتھ ساتھ وہ ایسی شخصیت ہیں جن کو ہم اسلامی معاشرے کا ایک مصلح جانتے اور کہتے ہیں،

کیونکہ وہ اپنے انسانی اور اسلامی معاشرے، ایک ایسے معاشرے کے باسے میں جس میں وہ خود رہتے ہیں، اور اس کی بیداری، نجات اور آزادی کے لیے جہاد کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف تفنن اور سائنس اور بقول ساڑھے "بائیں ہاتھ والوں کے روشن فکرانہ تظاہرات کی سیاسی شکلوں میں بلکہ ایک پابند اور سپردہ شدہ آدمی کی صورت میں لٹکا کرتے اور کام کرتے اور جستجو کرتے ہیں، اور یہیک وقت مولوی (مولانا جلال الدین رومی) کے بھی عاشق ہیں اور ان کے روحانی معراجوں میں ان کے ہم سفر اور ان کی عاشقانہ آگ، روحانی درد اور اضطراب سے جبلے ہوئے اور پچھلے ہوئے ہیں۔ وہ ایسے عظیم انسان ہیں جو یہ سوئی نہیں ہیں، پارہ پارہ نہیں ہوئے، وہ ایسے مسلمان ہیں جو ایک طرح کے اور ایک جانبہ نہیں ہیں، یعنی وہ کامل مسلمان ہیں۔ اگر وہ مولانا روم سے عشق بھی کرتے ہیں تو کسی وقت بھی مولانا کی ذات میں گم نہیں ہو جاتے اور ایک ہہلوکی طرف جھک نہیں جاتے۔

اقبال یورپ گئے اور یورپ میں ایک فلسفی کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے۔ انہوں نے یورپ کے فلسفی مکاتب کو پہچانا اور پہنچایا اور سب نے تسلیم کیا کہ وہ بیویں صدی کے فلسفی ہیں، لیکن انہوں نے مغرب کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا

انہوں نے مغرب کو تحریر کیا اور انہوں نے بیویں صدی اور مغربی مدنی میں ایک تنقیدی لکڑا اور قوت انتقام کے ساتھ زندگی گزاری۔ مولانا روم کے ساتھ بھی، جن کے وہ عاشق اور مرید ہیں۔ وہ اسی مقام تک ہیں جہاں تک کہ وہ روح اسلامی کے دیگر اصلی ہہلوؤں کے مقابل نہیں ہیں۔

وہ تصوف کے متعلق کہتے ہیں:

”چو قسمت ازی بی حضور ما کر دند  
گراند کی نہ بوقت رضا است خردہ مگیر“

(چونکہ ازی تقسیم ہماری غیر حاضری میں کی گئی اگر (ہمارے کام) کچھ (رضائے الہی) کے موافق نہیں ہیں تو ان پر اعتراض نہ کرو)۔  
یا

”زمانہ با تو نسازد تو باز ماہہ بساز“

(اگر زمانہ تمہارے لئے سازگار نہ ہو تو تم زمانے کے مطابق خود کو ڈھال لو)  
لیکن صوفی اقبال ہے کہتے ہیں:

”زمانہ با تو نسازد، تو باز ماہہ ستیز“

(اگر زمانہ تمہارے لئے سازگار نہیں، تو تم اس سے جگ کرو)۔

زمانہ یعنی انسان کی سرگزشت اور تقدیر، انسان کی زندگی اور انسان خود ایک ”موج“ ہے، ایک افتادہ (پڑا ہوا) ساحل نہیں، اس کا وجود، اور اسی حرکت کرنے میں ہے، میں کیا کہتا ہوں؟ ”حرکت کرنے میں ہے“۔

انسان کو اقبال کے عرفان کے مطابق، جو نہ تو ہندی تصور ہے اور نہ مذہبی جنون، بلکہ قرآنی عرفان ہے، زمانے کو بدل دینا چاہیے۔ قرآن کے اسلام نے ”آسمانی تقدیر“ کی جگہ، جس میں انسان کی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے، ”السمانی تقدیر“ کو دے دی ہے، جس میں انسان کا پذیادی کردار ہے۔

یہ عظیم ترین ”انقلابی اصول“ ہے جو بیک وقت مشرقی اور تعمیری اصول ہے کہ جسے اسلام نے انسان کی مذہبی جہان بینی، فلسفہ حیات اور انسان شناسی میں

بنایا ہے۔

اس نے فلسفہ مرکزیت انسان اور بیویں صدی کے جدید آزاد خیال مفکروں نے مذہب پر جو سب سے بڑی تنقید کی ہے، اور کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ وہ مذہبی عقیدہ جو "قابویت" ، مطلق آسمانی ارادے، یعنی مشیت الہی، اور زمین (والوں) کی مطلق مقہوریت، یعنی انسانی خواہش کی مقہوریت پر استور ہے، انسان کو منطقی طور پر غیبی قوتون کے ہاتھ کا ایک ناتوان اور بے ارادہ کھلونا دکھاتا ہے۔ اور یہ بذات خود ڈلت اور غلامی کا موجب ہے اور طاقت اور آزادی کے سلب ہونے کا سبب اور ذمہ داری کی نفع کا تیج اور اس کے نتیجے میں " موجودہ حالت" کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور جو کچھ کہ سپر آئے اس پر راضی رہنا اور دنیا میں ہر اس سرنوشت کو جو آدمی کے اپر لاد دیا جائے قبول کرنا اور عدم مقصدیت اور بے کاری (مہاں تک) کے جامد اخلاق اور نافرمانی کا اعتراف کرنا اور ہر قسم کی تنقید کی کوشش کے لئے اور انسان کی خواہش کو حالت کی تبدیلی اس کی جگہ لانے کے لئے جو ہلے سے یقینی طور پر اس کا مقدر ہو چکی ہے اور جو نکہ جو کچھ بھی ہے اور ماہی میں رہا ہے اور آئینہ ہو گا۔ وہ آسمانی تقدیر ہے، اس کی تغیریت تبدیلی اور اصلاح کے لئے انسان کی تدبیر ناممکن بھی ہے اور ناصحون اور خلاف شریعت بھی۔

لیکن اسلام کا فلسفہ، اس کے باوجود کہ خداۓ واحد اپنی مطلق سلطنت اور ملکوئی جبروت پر مسند نہیں ہے اور "خلق وامر" یعنی تخلیق کا کام اور ہدایت اور تدبیر اور دنیا پر حکومت کا کام بھی اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ "لِ الْخَلْقَ وَلِ الْأَمْرِ" (الاعراف آیہ ۵۲) (خلق اور امر اسی کا کام ہے) اس کے باوجود اس نے دنیا کی اس عظیم سلطنت

میں انسان کی اس طرح منصوبہ بندی کی ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ خداوند متعال کے قانون کے حدود اور اس کی حاکیت کے تسلط سے خارج نہیں ہو سکتا آزادانہ زندگی گزارتا ہے اور خداوند متعال انسانوں کے لئے اعلان کرتا ہے "ہم نے آپ کو محترم جانا اور خلکی سندھ اور زمین و آسمان کو آپکے اختیار میں دے دیا اپنی اس روح کو جو ، ارادہ ، قوت لیجاد و انتخاب و رہبری و تدبیر ، خود آگاہی اور مافوق فطرت صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور ان کے متعلق تفکر سے عبارت ہے۔ آپ کے اندر پھونک دیا ، تاکہ ہم جان لیں کہ آپ میں سے کون زیادہ نیک کردار رکھتا ہے "اسلام کا انسان ارادہ ، نافرمانی اور فرمانبرداری کا اختیار رکھتا ہے۔ اسی بنابر وہ اپنی تقدیر کا خود بنانے والا ہے۔"کل نفس بسا کسبت رحمتیہ" (المدثر آیہ ۳۸) (ہر نفس جو کچھ وہ حاصل کرتا ہے اس کامر ہون ہے) یعنی ہر فرد بشر پہنچے اعمال کا گروہی ہے اور انسان کے لئے ماسو اس کے جو کچھ اپنی کوشش ، حرکت اور جستجو سے حاصل کرتا ہے اور کچھ نہیں ہے "لیس الائنسن الاما سعی" (انجمن آیہ ۳۹)

اقبال نے قرآن میں اپنی عرفانی سفر کے دوران اس اصول ، یعنی انسان میں عمل اور ذمہ داری کے اصول کو پایا ہے ، یعنی جس چیز سے "فلسفہ مرکنیت انسانی" "وجودیت" اور "اہتا پسندی" کے پیرو کوشش کرتے ہیں کہ مذہب کی نفی اور خدا سے انکار کے ذریعہ اس تک انسان کو ہنچا دیں۔ اس لئے یہ لوگ درحقیقت مذہب اور مذاہب میں راجح خدا کے تصور کو آزادی ، عزم ، اصولوں پر عمل اور انسانی ذمہ داری کا مخالف سمجھتے تھے ، جبکہ اسلام بالکل واضح طور پر اور بغیر فلسفیانہ توجیہات اور تاویلیات کے اعلان کرتا ہے کہ انسان کی آغزی سرنوشت اس دن میں

مضر ہے جب انسان وہ سب دیکھے گا جو کچھ وہ لپٹنے دونوں ہاتھوں کے ذریعے ہٹلے سے کما چکا اور بھیج چکا ہو گا۔

"یوم ینظر المرء مقدمت یہاہ" (النبا، آیہ ۲۵)

اقبال نے اس زمانے کی تمام فلسفیات اور روحانی مژلوں کو اپنی بصیرت، ایمان اور عرفان اسلامی کی سمت یا بی کے ذریعے طے کیا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک "مہاجر مسلمان ہے جو ہندوستان کے پر اسرار اوقیانوس سے اٹھا اور یورپ کے پر اقتدار بلند ترین کوہستان کی چوٹیوں کے اور پہنچ گیا، لیکن وہاں رہا نہیں، ہمارے درمیان لوٹ آیا، تاکہ لپٹنے حیرت انگریز سفر سے لائے ہوئے تھنھے کو اپنی ملت یعنی ہمیں عطا کر دے اور میں اس کی شخصیت میں دیکھتا ہوں کہ ایک بار پھر اس نے اپنی پریشان، خود آگاہ اور در دنہ نسل کے لئے بیسویں صدی میں اسلام کی "نونہ سازی" کی ہے۔

اقبال نے ایک نرم کرنے والی اور الہام سے بھری مشرقی روح کو اشراق اور دل کی ثقافت کی سر زمین سے چن لیا، عزب کے عظیم تفکر کو جو تمدن، عقل اور علم کی سر زمین ہے، خلاقیت اور ترقی کی تمام ترقوت کے ساتھ اس کے دماغ میں رکھ دیا اور اس قسم کے سرمائے کے ساتھ بیسویں صدی کو ہچان لیا ہے۔

وہ ان قدامت پرستوں اور رجھت پرستوں میں سے نہیں ہیں کہ بغیر ہچانے ہرشے سے جو جدید ہو اور جدید تمدن اور مغرب سے ہو، بلا سبب و شمنی کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ ان کی مانند بھی نہیں کہ جو بغیر تنقید و انتخاب کی جرأت رکھتے ہوئے مغرب میں کھو جاتے اور اس کے مقلد بن جاتے ہیں۔ اقبال ایک طرف سائنس سے

خدمت لیتے ہیں اور دوسری طرف انسان کی تمام معنوی ضرورتوں اور ارتقائی تقاضوں کے سلسلے میں ساتھ کو ناکافی اور ناقص سمجھتے ہیں اور اس کی تکمیل کے لئے ان کے پاس راستہ موجود ہے بہر حال اقبال ایک ایسے شخص ہیں جن کے پاس دنیا کا اور اک ہے اور اس عالم شناسی اور فلسفیانہ روحانی تفسیر جو وہ جہان اور انسان کے بارے میں دیتے ہیں، کی بنیاد پر انہوں نے اپنے معاشرتی مکتب کی بنیاد رکھی ہے اور جس ثقافت اور تاریخ سے وہ والبست ہیں اس کی بنیاد پر، جہان تک کہ ہماری بیسویں صدی کی انسانی عمارت کے مصالحے میں صلاحیت ہے۔ اسے اسی طرح جیسے کہ وہ خود معیار قرار دیتے ہیں۔ علیٰ کی فکر پر تعمیر کیا ہے۔

علیٰ کی کونسی فکر؟ یعنی کس طرح سے یعنی مشرقی دل اور مغربی دماغ رکھنے والا انسان وہ آدمی جو درست اور گہری سوچ بھی رکھتا ہے اور خوبصورت اور پر شکوہ انداز میں عشق بھی کرتا ہے۔ وہ شخص جو روح کے دردوں سے بھی آشنا ہے اور زندگی کے رنجوں سے بھی باخبر ہے وہ شخص جو خدا کو بھی پہچانتا ہے اور خلق کو بھی جانتا ہے وہ پاک بازو پار سا جو نور معرفت کی روشنی اور آتش عشق و ایمان کی سوزش رکھتا ہے اور ایک لمحے کے لئے بھی دربست ملوٹ کی تقدیر کے بارے میں اس کی تیز بین آنکھ کے سامنے غفلت و جہالت کا سیاہ پرده نہیں پڑ جاتا اور اس نے اصلاح اور انقلاب و فکری تغیری کی بنیاد رکھی ہے، اور اسی طرح سے ایک مفکر کی حیثیت سے اس نے بھی لیا ہے کہ ساتھ کی خشک آنکھ (جیسے کہ فرانس بیکن کہتا تھا) ایسی آنکھ نہیں ہے کہ دنیا میں تمام حقیقت کو پا لے۔ اسی طرح اسے یہ احساس ہے کہ ایک عاشق کا شیدا دل صرف ریاضت اور تصفیہ باطن و تزکیہ نفس سے کسی منزل پر بھی نہیں

پہچتا۔ اسی لئے کہ انسان معاشرے اور زندگی و مادہ کے ساتھ وابستہ ہے اور ہنہا خود کو نکال کر نہیں لے جاسکتا۔ فرد معاشرے کے کاروائی کے ہمراہ حرکت میں ہے اور اپنی راہ کو اس سے جدا منتخب نہیں کر سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ جس طرح ہم سب کی آرزو ہے کہ ہمارے پاس ایک ایسا مکتب ہو کہ ہماری فلسفیانہ ضرورت کو بھی پورا کر دے (اس دنیا میں جہاں مکاتب بھی اور فلسفے بھی آج کے انسان اور آج کی فکر کی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے) اور ایک ایسا مفکر انسان بنائے جو آج کی دنیا کو اور نئی دنیا کے تحدیں اور ثقافت کو بھی پہچانے اور خود ہم سے اور ہماری ثقافت کے غنی سرمایوں سے بھی نا آشنا و یگانہ نہ ہو ایسا انسان جو ہماری ثقافت اور تمام معنوی و مذہبی سرمایوں سے نزدیک سے اور صحیح طور پر آشنا ہو، مگر زمانے سے یگانہ نہ ہو اور چوتھی اور پانچویں صدی میں زندگی نہ گزارتا ہو، اسی طرح وہ انسان جو سوچ سکتا ہو اور وقیت سانتسی فکر رکھتا ہو اور اپنی امت کے رنج اور زندگی، غلامی اور سختی سے غافل نہ رہے اور ایسا انسان جو پھر اگر مطلق انسانی رنگوں اور مادی تکلیفوں کی طرف رخ کرتا ہو اور موجودہ انسانی معاشرے یا اپنے معاشرے کے انتشار اور بد تکلیفوں پر غور کرتا ہو تو پھر بھی انسانی مثالی تصور اور انسان کے جامع مفہوم اور تاریخ میں انسان کے ابتدی فریضے منصبی سے غافل نہ رہے اور انسان کو اور تمام انسانی مثالی تصورات کو مادی صرف کے مرحلہ میں نیچے نہ لائے۔

ان سب چیزوں کو، جنہیں ہم گوناگون میدانوں میں چاہتے تھے، ہم اقبال میں دیکھ سکتے ہیں۔ اسی لئے کہ ہنا کام جو اقبال نے کیا ہے، اور یہ ایک مسلمان

ہونے کے ناطے بیویں صدی کے مسلمان معاشرے میں اقبال کی سب سے بڑی کامیابی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ان تمام شاختوں کی بنیاد پر جو جدید اور قدیم ثقافت کی برکت سے وہ رکھتے ہیں، خود کو اس نمونے پر جو ان کے اعتقادی مذہب، یعنی اسلام نے دیا ہے، تعمیر کر سکیں یہ بیویں صدی اور ہمارے معاشرے میں اقبال کی سب سے بڑی کامیابی اور سب سے بڑی عظمت ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ شخصیت کامل ہے۔ ہرگز نہیں میں یہ بھی نہیں کہتا ہوں کہ شخصیت علامت ہے، نہیں۔ وہ ایسی شخصیت ہے کہ جو ایک کامل مسلمان اور کامل اسلامی شخصیت کے بکھر جانے کے بعد بیویں صدی میں دوبارہ تعمیر ہوتی ہے۔ یہ دوبارہ تعمیر ہونا ایک کام کا آغاز ہے کہ ہمیں روشن خیال مسلمانوں کی حیثیت سے چاہیے کہ اس کام کو انجام دیں پا رانی عمارات اور اسی طرح لپتے معاشرے کی عمارت میں عظیم ترین ذمہ داری کا احساس کریں۔ سب سے پہلے سید جمال الدین تھے جنہوں نے اس بڑے سونے اور کمی صدیوں کے عظیم انسان (یعنی مسلمان) کو آگاہ کیا کہ تو کیسیا ہے اور کیسیا ہے، اور اقبال اس تحریک کے آغاز کے بعد پہلی مرتبہ پہلا پھل تھا اسیع کا جسے سید جمال الدین نے اس بخوبی شدہ امت (کی زمین) میں بکھرایا اور یہ پہلا پھل، ایک بڑا نمونہ، اور عظیم قابل تقلید مثال اور "ہمارے" لئے بہت ہی ولولہ انگریز ہے۔ "ہم" جو مشرقی ہونے کی حیثیت سے اور اس نقطہ زمین سے وابستہ ہونے کے حوالے سے اور اس تاریخ سے وابستگی کے ناطے اور بحیثیت ایک انسان فطرت کے رو برو اور ایک انسان کی حیثیت سے مزب کے سامنے (کھڑے ہیں)۔

مگر یہ کہ اقبال ایک مصلح ہیں اس کے کیا معنی ہیں؟ آیا اصلاح معاشرے کو تمام انتشارات، دردوں اور بدجھیوں سے واقعی نجات دے سکتی ہے؟ یا ایک شدید، ناگہانی اور گہری جزوں والا انقلاب بپاہوتا چاہیے سوچ میں بھی اور معاشرتی تعلقات میں بھی؟

جب ہم کہتے ہیں اقبال ایک مصلح کی حیثیت سے، تو وہ خواتین و حضرات جو تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان رائج اصطلاحات سے آشنا ہیں، سوچتے ہیں کہ اس صفت کو ہم سیاسی عمرانیات کی مردوجہ اصطلاح کے معنی میں استعمال کرتے ہیں جس کے معنی اصلاح یا ریفارم<sup>۱</sup> کے ہیں، لفظ "انقلاب"<sup>۲</sup> کے مقابلے میں عام طور پر جب ہم کہتے ہیں "اصلاح" تو اس کے معنی ہوتے ہیں تدریجی تبدیلی یا بالائی تعمیر اور جب ہم کہتے ہیں "انقلاب" تو اس کے معنی ایک ناگہانی تغیری یا زیر سازی، تمام چیزوں کا ٹوٹ پھوٹ جانا یا تمام چیزوں کی از سر نو بنیاد رکھی جانی۔ لیکن جب ہم اس تغیر میں یہ کہتے ہیں کہ اقبال ایک مصلح ہیں تو ہماری توجہ معاشرے میں اس تدریجی تبدیلی کی طرف نہیں ہوتی اور مقصود بذریعہ تبدیلی یا ظاہری اصلاح نہیں ہوتا بلکہ اس لفظ کو اس کے لغوی معنی میں جس میں انقلاب بھی شامل ہے، استعمال کرتے ہیں۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اقبال "مصلح" ہیں یا یہ کہ سید جمال الدین<sup>۳</sup> کے بعد کے بڑے مفکر دنیا میں اس صدی کے "مصلحین" کے طور پر پیش کئے گئے ہیں،

1- Reform

2- Revolution

تو اس کا یہ مقصد نہیں کہ وہ معاشرے میں تدریجی ارتقاء اور ظاہری اصلاح کے حامی تھے۔ نہیں، بلکہ ایک معنی میں وہ عمیق اور گہری جزوں والے انقلاب کے حامی تھے، سوچنے میں، دیکھنے میں، اور احساس کرنے میں انقلاب، نظریاتی اور ثقافتی انقلاب! اقبال، سید جمال الدین کوکبی، اور محمد عبدہ بن ابراہیم اور انھیں علمائے مغرب کے سبران وہ عظیم شخصیات ہیں جنہوں نے اس آخری سو سال میں مشرق کو ہلاکر رکھ دیا۔ ان کی اصلاح کی ساری بنیاد اور ہبہ تعبیر کے طور پر ان کا "اصلاحی انقلاب" اس اصول کے اعتراف اور اقرار پر استوار ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ اصلاح کا امکان انفرادی نہیں ہے۔

چند افراد، کیوں جیسے بھی میں نے "انتخاب" کیا ہو، زندگی گزار سکتا ہوں، زمانے اور معاشرے سے کوئی اثر نہ ہوں اور آکلوہ زمانے اور گمراہ معاشرے میں لپٹنے آپ کو ایک "پاک" اور "سچا انسان" بناؤں۔ اگر "فرد" کے لئے معاشرے میں ایسا امکان نہ ہوتا، تو "ذمہ داری" کے مسئلہ کے کوئی معنی نہ ہوتے۔

مگر میں اس قسم کی اصلاح کے متعلق شک رکھتا ہوں کہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک انسان ایک ماحول میں زندگی گزارے اور اس سے اثر نہ لے؟ ماحول (یعنی ان حالات اور عوامل کا مجموعہ جو تاریخ، فطرت، معاشرہ، انفرادی تعلقات اور خادمان اور موروثی خصوصیات بناتی ہیں اور "فرد" کو اندر اور باہر سے لپٹنے آپ میں لے کر پروان چھوٹاتی ہیں) فرد کو بناتا ہے۔ اگرچہ فرد بھی ماحول پر اثر ڈال سکتا ہے اور یہ تاثیر اور اثر گزاری تکمیلی فرد کی قوت ارادہ کی ترقی یافتہ خود آگاہی، علمی و سائنسی اور تکمیلی طور پر آرائستہ ہونے کے مجموعہ سے والستہ

ہوتی ہے۔

فرد جس قدر زیادہ ترقی، ثقافت اور خود اگاہی سے آراستہ ہو گا، اتنا ہی زیادہ ماحول کی تبدیلی، اصلاح اور معاشرتی انقلاب کی طاقت اور اس کا امکان رکھتا ہو گا اور اس بات کی زیادہ قدرت حاصل کر لیتا ہو گا کہ خود اپنی اور معاشرے کی قسمت کو بنائے یا اس کے بنانے میں حصہ دار ہو اور اسی بناء پر اس کی ذمہ داری اور اس کا عہد زیادہ قابل بحث ہے۔ اس کے نتیجہ میں یہ مسئلہ کہ "اچھا اور صالح فرد" تربیت کیا جائے یا "اچھا اور صالح معاشرہ" بنایا جائے بالکل بے معنی ہے۔

یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ فقط ایک معاشرتی جہاد ہے جس میں انسان فطری اور سچی ترقی پاتا ہے۔ علیحدگی میں فلسفی، شاعر، پارسا عابد تو بنائے جاسکتے ہیں لیکن "مسلمان" نہیں بنایا جاسکتا۔

ممکن نہیں کہ جب زمانہ اور معاشرتی تعلقات، آلوہو ہوں اور معاشرے کی ثقافت، تربیت، روحانی، سیاسی اور اقتصادی حرکت کا راست آلوہگی کی طرف رخ کئے ہوئے ہو تو ہم یہ امید کریں کہ ہمارے پاس صالح انسان ہوں گے۔ یہ بات ممکن نہیں ہے۔

اگر ایک شخص اپنے آپ کو سیلاب اور اجتماعی سقوط سے بچا بھی سکے، اور اگرچہ اس میں کامیاب بھی ہو، پھر بھی وہ نہایت بڑی خیانت کا مرکب ہو گا۔ اس لئے کہ اس کا سب سے بڑا مشن دوسروں کی اصلاح اور اپنے معاشرے کی اصلاح رہا ہے، جو اس نے انجام نہیں دیا ہے۔ دوسروں سے خیانت کی قیمت پر اپنی خدمت نہیں کی جاسکتی، جو شخص چالاکی اور اپنی جدوجہد سے اس زندان سے، جس میں وہ

اپنے رشتہ داروں ہم خیالوں ہمدردوں اور آزادی کے خواہاں لوگوں کے ساتھ قید ہے، بھاگ نکلے تو اس نے اپنی آزادی تو حاصل کر لی، مگر وہ ہرگز ایک آزاد انسان تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ایک خود عرض، ذلیل اور آرام طلب اور بے قدر و قیمت شخص ہو گا۔ اسے حق حاصل نہیں کہ اس آزادی پر فخر کرے۔ اسے ہرگز اس کا دم نہیں بھرنا چاہیے (کیونکہ) یہ ایک نجات نہیں، تنگ ہے۔

میری رائے میں اسلام کا عظیم ترین انقلاب عمل اور انسانی قدر و قیمت اور وہ سب سے بڑی خدمت جو اس نے انسانی تمدن اور تاریخ کی انجام دی ہے، (صرف مسلمانوں کی نہیں)، یہ ہے کہ اسلام مذہبی عشق اور مسخرہ آسا اور غیر مادی عرفانی احساس کی طاقت کو جو انسانوں کے اندر موجود ہی ہے اور ہمیشہ روحوں کو انقلاب جانبازی، موت اور شہادت کے سیدھے سادے استقبال اور اپنی اور اپنے پیکوں کی راہ میں اپنے معبود کی راہ میں آسٹا شعبادت گاہ پر قربانی پر آمادہ کرتی رہی ہے، انسانی معاشرہ کی تعمیر اور انصاف کے قیام، دنیا کی اس مادی اور معنوی زندگی میں حصول اقتدار اور ترقی کے لئے کام میں لایا ہے۔

شاید انسان کی معاشرتی اور معنوی زندگی کی تاریخ میں اسلام کا عظیم ترین انقلاب، مذہب کی عظیم طاقت کے سمت کی اصلاح ہے، یعنی ان تمام قتوں، خونوں، وقتوں اور طریقوں کو جو محрабوں، خانقاہوں، میروں اور بہت خانوں میں صائع ہو رہے تھے، حرکت انسانی معاشرہ کے ارتقاء، استبداد اور اسحصال اور عوام کی جہالت کے برجوں اور قلعوں کی قتنا، اور روح، انصاف پسندی، ثقافت اور اس دنیا کی زندگی کے سب ہم لوگوں کی ترقی کی راہ میں کام میں لانا۔

یہی انفرادی اصلاح تزکیہ نفس اور اخلاقی ارتقاء و تقویٰ کا حصول اور اصلاح نفس کا تہا طریقہ ہے۔

محشرے سے علیحدہ ہو کر گوشہ نشینی اختیار کرنے اور لوگوں کی تقدیر سے غفلت اور محاشرتی ذمہ داری کو فراموش کرنے سے تقویٰ، تزکیہ نفس اور انفرادی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ یہ طریقہ اسلام میں بھی نہیں ہے۔ ہرگز، نہ تو افکار اور ان سکتی بنیادوں کی تصدیق کی رو سے جو ہم رکھتے ہیں اور نہ ان اشخاص کی رو سے جو ہمارے پاس تاریخ اسلام میں تربیت شدہ افراد کے مظہر کے طور پر تھے، الیسا طریقہ رہا ہے۔

ہم پیغمبرؐ خدا کے ارد گرد کسی الیے عابد، دیر نشین یا صحابی گوشہ گیر کو نہیں جانتے۔ سہاں تک کہ اصحاب صفا بھی، جن سے ہمارے عرفاء اور زیاد اپنے آپ کو وابستہ کرتے ہیں، ہاتھوں میں شمشیر لئے مشن اور جہاد کے لئے تیار تھے۔ جہنوں نے اپنے گھر بار اور ذاتی زندگی سے اپنے دل کے رشتہ کو توڑ لیا تھا، لیکن یہ اپنے آپ کو ضائع کرنے اور عبادت گاہوں اور پہاڑوں کے غاروں اور نیہد پرستی اور رہبانیت کی درگاہوں کو چومنے کے لئے نہیں تھا، بلکہ اس کے بالکل بر عکس اس لئے تھا تاکہ اپنے تمام وجود اور اپنی عمر کے سارے لمحات کو محاشرتی کام اور اپنے اعتقادی جہاد کے لئے دقف کر دیں۔ وہ استثنائی لوگ تھے جہنوں نے اپنی انفرادی زندگیوں کو محاشرتی اور فکری جہاد پر نثار کر دیا تھا۔

ہماری بیویں صدی کے تمام مسلمان مصلحین بھی یہی فکری خصوصیات اور یہی اصلی اور واضح اعتقاد رکھتے تھے، چونکہ یہ اسلامی بصیرت کے واسخات اور

اسلام کے مسلم اصولوں اور مذہبی عقاید کا ایک حصہ ہیں اور درحقیقت اسلامی مکتب کی "سمت" ، "محاڑا رائی" اور روش اور مجموعی بصیرت اور اسلامی روح کا عام رحجان ہی ہے ۔

یہاں تک کہ دشمنان اسلام جو ہمارے پیغمبر کو "صلح پیغمبر" اور اسلام کو شمشیر کا مذہب کہتے ہیں ، اس بات کے معرفت ہیں کہ اسلام ایک معاشرتی مذہب ہے ۔ ورنہ کلاسیکی معنوں میں ، عرفانی جذبے ، تزکیہ نفس ، انفرادی اصلاح ، دینی تقویٰ کو تو شمشیر کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ اس لئے کہ ایسے کام تو ہر حکومت اور ہر حالات میں کیا جاسکتا ہے ۔ استہدا ، اسخصال ، قلم ، غصب اور جرم نہ صرف اس کے مخالف نہیں ہیں بلکہ وہ تو تمام ضروری اور مناسب حالات کو فراہم کرتے ہیں تاکہ آدمی ایک گوشے میں چلا جائے اور لوگوں کے کام اور تقدیر سے کوئی واسطہ نہ رکھے اور نفس سے جہاد کرے ۔ وہ اس جہاد میں انسان کی مدد کرتے ہیں ۔

اسلام میں فرد معاشرے کی اصلاح کے جہاد کے دو ران انفرادی اور اخلاقی اصلاح تک پہنچتا ہے اگرچہ وہ لپٹنے جہاد میں کامیاب بھی نہ ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری رائے ہے کہ ایک آلوہہ معاشرے میں بھی ایک صاف فرد کا وجود ہو سکتا ہے ، لیکن وہ بنایا جا سکتا ہے اور انفرادی ذمہ داری میں سے پیدا ہو جاتی ہے ۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ فرد کی ذمہ داری لوگوں کو خود آگئی دینا اور تمام گمراہ کن ، مرلینیں کرنے والے ، ترقی سلامتی اور حقیقت کے مخالف عناصر سے جہاد اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بھی یہی معنی ہیں ۔

مسلمان فرد خدا کے رو برو ، یعنی لوگوں کے راستے ، سرنوشت اور طرز تفکر

کے بارے میں ذمہ دار اور اس کا عہد کئے ہوئے ہے۔ فکری عہد بھی اور علی و معاشرتی عہد بھی۔ امر بالمعروف اور نبی عن المکر کے معنی وہی اصول ہیں جو آج مغرب میں اور بیدار دنیا کے سامنے اور معاصر روش خیالوں کے درمیان "انسان اور روشن خیال دانش" اور فنکار کی ذمہ داری اور اس کے عہد کا مسئلہ "کے عنوان سے تیر بحث ہے، بے بنیاد اور پچگانہ نصیحتوں کے طور پر نہیں۔

امر بالمعروف اور نبی عن المکر کے معنی ہیں فرد کی اپنے معاشرے اور جس مکتب کا وہ پیرو ہے اس کے متعلق سونپی گئی ذمہ داری، یعنی وہی روشن خیال شخص کی ذمہ داری، ایک مسئلہ انسان کی ذمہ داری ہو کسی نظریے پر اختقاد رکھتا ہو۔

افسوس ہے کہ میرے پاس فرست نہیں ہے کہ بیویں صدی کے مسلمین کے بارے میں ایک ایک کر کے بات کروں۔ اگر ایک ایک کا نام لینا چاہوں تو مجھے ان کا نام لینے، ان کے آثار اور زمانے کی یاد ہیانی، اور ان کی زندگی کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرنا ہو گا، اور وہ بھی بے فائدہ ہے، مگر میں ان بنیادوں اور اصولوں پر بحث کرتا ہوں جن پر اسلام کی تحریک بیداری یا یعنی نشانہ ثانیہ یا انی پیدائش کا انحصار ہے تاکہ مسلمان اور روشن فکر افراد کم از کم اس کی سمت، اور جمیعی کو اتفاق کا احساس و ادراک کر سکیں۔

اپنے حقیقی معنوں میں "رنا سنس" <sup>①</sup> کا لفظ اس تحریک کے لئے کہیں زیادہ معنی رکھتا ہے اور اس روح اور معنوں کے پیش نظر جو اس تحریک کے رہبر

اور پیر و کار اس کا مفہوم سمجھتے رہے ہیں، یہ لفظ زیادہ مناسب ہے بہ نسبت اس معنی کے جو پندرہویں اور سوہویں صدی میں قرون وسطی کی یورپی تحریک کے لئے مستعمل رہا ہے۔ اس لئے کہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ تاریخ ہمیں واضح طور پر دکھاتی ہے کہ اگر ہمارا معاشرہ دوبارہ پیدا ہو تو یہ مردہ اسلامی معاشرہ ہبھلی درخشنان پیدائش کی طرح شریار، اور طاقتور ہو کر ترقی کرے گا۔

تاریخ معاشرہ کی ہبھلی پیدائش کو اسلام کے بارے میں کیوں کر دکھاتی ہے؟ کس طرح سے اس کی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے؟ یہ نہیں کہتی ہے کہ "جس زمانے میں پیغمبر اسلام کی ولادت ہوئی، تکب خانے زیادہ ہو گئے۔ عرفان نے چمک دیک اختیار کی، خدا نے عشق رقص کرنے لگا، خدا نے علم بیجان میں آگیا، خدا نے جنگ مرتع روزگیا، ہر کوں کے ہاتھوں سے تیر کمان گر گئے، آسمان سے ایک نور چمکا، زمین کو زلزلہ آیا۔" نہیں، بلکہ فارس کا آتش کده، جھوٹی آگ بجھ گئی اور ساسانی محل کا کلگردہ گر گیا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایک پر معنی پیدائش ہے ایک نئی روح اور نیا عرفان اور ایک احساس اور ایک اشراق ہے کہ مذہب کی صورت میں ہے۔

مگر تمام راجح مذاہب کے برعکس اسے ایسٹ سے، اس ایسٹ سے کہ جس پر نیوچی عمارت تعمیر کی گئی ہے، سروکار ہے۔ اسے ہر اس درود یوار اور بنیاد سے سروکار ہے جو ستم سے اٹھی ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس پیغمبر نے اس لئے ظہور نہیں کیا ہے کہ خود کو زرتشت، مانی، مزدک اور کنفیو شن وغیرہ کی طرح اس محل تک پہنچائے اور دربار میں شاعر، مشی اور خواجہ کی صفت میں آئیٹھے، بلکہ یہ تو اس لئے آیا

ہے اس محل کو ویران کر دے۔

”جیسے ہی پیغمبر اسلام نے جہان میں آنکھ کھولی فارس کا آتش کدہ بجھ گیا اور  
کاخ مائن کا لکنگرہ گر گیا۔“

یہ اسلام کے زاویہ لگاہ اور اس دنیا اور معاشرے میں اس کے مشن کی  
کیفیت بیان کرتا ہے۔

افسوس ناک طور پر مسلمان روشن خیالوں کے ایک گروہ کے افراد یہ چلتے  
ہیں کہ اسلام کو آج کی روح کے مطابق اور آج کی زبان میں بیان کریں اور ہمارے  
زمانے کی روح جس کفر اور روشن کو بھی پسند کرتی ہو اور جو آج کا فیشن ہو اس طرف  
رخ کریں۔ آج بھی جب عالمی امن، صلح آمیز بقاۓ باہمی، عدم تعصب تمام عقاید و  
افکار کی آزادی اور ان کا احترام فیشن ہو گئے ہیں، ہمارے مسلمان روشن خیال، یا  
ہمارے نئے روشن خیال بھی حریت پسندوں، جمہوریت کے حامیوں اور فلسفہ  
مرکبیت انسان کے پیروؤں کے لئے بیان کرتے ہیں کہ اسلام ”سلم“ سے ہے اور  
سلم کے معنی صلح اور صلح کے معنی صلح آمیز بقاۓ باہم اور طبقات و مذاہب، افکار و  
عقاید کے مابین افہام و تفہیم پر مبنی دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنے کے ہیں۔

کتنی عجیب بات ہے! اسلام صلح نہیں، اسلام جنگ ہے۔ پادریوں اور  
استعمارگروں اور ان کے ہمدست ظاہری روشن لکروں کے اتہامات سے نہیں ڈرنا  
چاہیے اور سرایسمہ نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام کا میک اپ کر کے اور اس کو آج کا ظاہر  
کرنے سے کام آگے نہیں بڑھے گا۔ حقیقت کو جیسی کہ وہ ہے جاتا چاہیے نہ کہ ولیے  
جیسے کہ وہ پسند کرتے ہیں۔ جہاد کی توجیہ دفاع کے عنوان سے نہیں کرنی چاہیے۔

دفع کے دوسرے احکام ہیں اور جہاد کے دوسرے احکام ہیں ۔ اسلام آدم سے تاریخ کی اہتا (آفرالزمان) تک حق اور باطل کی جنگ ہے ۔

وہ تحریک جو اسلام کے ماحول میں آخری مصلحین کے ذریعے، چین سے لے کر خلیج فارس اور شمالی افریقہ تک، انسیویں صدی کے اواسط سے اب تک وجود میں آئی ہے، ان تاریخی تحریکوں کے تسلسل میں ایک تحریک ہے، جن کی بنیاد پر ادیان ابراهیمی کے فلسفے کی تاریخ استوار ہے ۔ یہ تحریک کلامی، فلسفی اور ماورائے طبیعتی مسائل کے چوکھے میں مصور نہیں ہے ۔ اس مبارزے کے تیز کنارے اس عینی نظام کی طرف رخ کئے ہوئے ہیں، جو تاریخ، زندگی اور لوگوں پر حکم فرماتے ہے ۔ اپنے سامنے ایشیا اور افریقہ کا نقشہ کھول لیں ۔ ہم افریقہ کے جزءیہ کو بہتر طور پر ہبھاتتے ہیں ۔ کیونکہ افریقہ میں جو استعمار اور مغرب کے علاوہ انقلابات اور تحریکیں وجود میں آئیں انہیں ہبھاتتے ہیں ۔ وہ زمانہ حال کے زیادہ قریب ہیں ۔ ابھی خبروں کا حصہ ہیں ۔ ہم سب جانتے ہیں ۔

افریقہ میں اسلامی اقوام اور ممالک کا ایک سلسلہ ہے اور غیر اسلامی اقوام اور ممالک کا ایک سلسلہ ۔ لیکن دنیا کے جزءیاتی نقشہ پر سب افریقہ اسلامی افریقہ کے رہنے والے فرانسیسی مصنف، شاندل کے بقول ایک "قطروہ اشک" اور ایک "گرم اشک" کے قطروہ کی صورت میں ہے ۔ جی ہاں افریقہ زمین کا اشک ہے، زمین کا پچھلا ہو اول ہے ۔ دل بھی اشک کے مشابہ ہوتا ہے ۔ کیونکہ دونوں کی پیدائش ایک ساتھ ہوئی ہے، اور دونوں کا درد مشترک ہے ۔ افریقہ نیز ان دونوں کا رشتہ دار

۔

تاریخ میں صرف افریقیت کے اسلامی ممالک ہیں کہ جن پر اتفاقاً غلام بنانے کا الزام ہے، مگر غلام دینے کا الزام ہرگز نہیں ہے۔ ہرگز کبھی کوئی مراکش، ٹیونس یا مصر و الجزائر سے کہیں بھی غلام لے کر نہیں گیا۔ جدید دور میں تمام افریقیت نے زبردستی، طاقت، یا کمر سے استعمار کے سامنے ہتھیار ڈالے ہیں۔ مرکزوی مغربی اور مشرقی افریقیت نے حال ہی میں عسوس کیا ہے کہ کب استعمار آیا اور کس سادگی سے وارد ہو گیا۔

استعمار، سمجھی مبلغین یا یورپی مہاجرین کی صورت میں جو سرمایہ کاری، آبادی اور پیداوار اور کام کاچ اور ترقی کے لئے آتے، تاکہ ایک گوشے میں زندگی گزاریں اور اس کی آباد کاری میں مصروف ہوں (استعمار کے یہی معنی ہیں) یا فرانس انگلستان وغیرہ کے تاجرین کے ایک گروہ کی شکل میں آتے، سادگی سے، اور ہبہاں تک کہ مقامی لوگوں کے استقبال اور بعض اوقات ان کی موافقت اور خوشنودی سے داخل ہوتے اور آہستہ آہستہ تمام چیزوں کے مالک بن جاتے۔

انسیوں صدی میں نئے نئے انہوں نے رنگدار شیشیوں سے اور مصنوعی جواہر، ہیرے بنانے تھے۔ فرگی رنگ مٹھی بھر رنگدار شیشیوں کو اٹھایا اور افریقیت لے جاتا۔ افریقیت کے روسا اور اشراف اور قبائل کے شیوخ کو تحفے کے طور پر پیش کرتا، خصوصاً جشنوں، شادی اور قبیلے کی تقریبات میں مٹھی بھر شیشیہ دے دیتا اور اس کے مقابلے میں بھریوں کا ایک گرے لے لیتا تھا۔

فیشن پرستی غیر ممتدن صحرائی فکر اور روح کی اصلی خصوصیات میں سے ہے جدید صحرائی اور غیر جدید صحرائی میں فرق نہیں ہے۔ فیشن پرستی ان سلطھی اور غرب

روحوں کی ضرورت ہے جو روح کی خوبصورتیوں اور معنوی سرمایوں ، مناظر ، انقلابوں اور ان عظمتوں سے محروم ہیں ، جو ایمان ، فکر ، علم ، ہمز ، ادب ، فلسفہ اور آدمی کے دل کی عجیب و غریب پروازوں میں سے ہیں ۔ اس حقیقت کا مطالعہ ان افراد کے درمیان موازنہ کرنے سے جو فکر اور ثقافتی اور معاشرتی ترقی کے لحاظ سے مختلف درجات رکھتے ہیں ، کیا جاسکتا ہے ۔

یہ کل کا افریقہ تھا ۔ استعماری کی طرح خاموشی سے بغیر قدموں کی آہٹ کے افریقہ میں داخل ہوا ۔ کوئی نہیں سمجھا کہ اور کہاں سے آگیا ۔ اس وقت سمجھے جب انہوں نے دیکھا کہ وہ ہزاروں سچے جن چکا ہے اور اس کی چوتھی ، پانچویں یا چھٹی نسل ہے ۔ اس وقت سمجھے جب انہوں نے دیکھا کہ اس امر کے بارے میں گلستان ہو رہی ہے کہ آیا افریقائی ملک میں حکومت کے لئے خود افریقیوں کو رائے دینے کا حق ہے یا نہیں ، آج افریقہ کے پاس جو موکینیا اور لومو مبار..... کی مانند بڑے رہبر اور مفکر ہیں ۔ ان لوگوں نے محسوس کیا کہ یہ نیلی آنکھوں والے کس طرح آئے اور کیوں کر افریقہ میں گھل مل گئے ۔ کینیا کے داشمندر ہبر جو موکینیاٹا کہتا ہے : ”جب یہ یورپی آئے ہمارے پاس زمین تھی ۔ ان کے پاس انجلی تھی ، لیکن اب ان کے پاس زمین ہے ہمارے پاس انجلی ।“

مگر سیاہ غیر مسلمان افریقہ کے بر عکس ۱۸۱۳ء سے ۱۹۴۱ء تک دیکھیں ۔ شمالی افریقہ اور افریقہ کے اسلامی معاشرے میں کونے سال تلوار رکھ دی گئی سہیاں تک کہ صحراؤں اور صحرائے قبائل ، شمالی افریقہ کے دور افتدادہ گاؤں ، ثقافت اور قومی آزادی ، انسانیت ، دوستی و مذہب ، تمدن اور قومی اور اسلامی زبان کے وفاداروں اور

نگہبانوں اور ہوشیار، باقدرت، مہندن فرانس کے عملی اور ثقافتی، اقتصادی اور فوجی معاشرتی علوم کے ماہرین کے ہر طرف سے محملہ کی وجہ سے میدان جنگ بن گئے اور فرانسیسیوں سے ہٹلے ہسپانوی تھے اور مصر میں انگریز بھی تھے۔ آخر کار یورپ نے شکست کھاتی۔ یہ جنگ ایک صدی سے زیادہ ۱۲۰ سال تک جاری رہی۔ چار پانچ نسلیں آئیں اور گئیں اور یہ فرانسیسی نہ بن سکے۔ فرانسیسیوں نے اعلان کیا: "جس طرح سے دریائے سین یورپ کے درمیان سے گزرتا ہے، اس طرح بھیرہ روم بھی فرانس کے درمیان سے گزرتا ہے" اس لئے کہ بھیرہ روم کے اس طرف الجزائر، ٹیونس اور مراکش ہیں اور اس طرف فرانس ہے اس بنا پر بھیرہ روم فرانس کے وسط سے گزرتا ہے۔ جب افریقہ میں داخل ہوتے تو بعض جگہوں پر ناگہاں سائن بورڈ دیکھتے جس پر لکھا ہوتا "یہاں فرانس کی سرحد ہے"! مقصود یہ تھا کہ وہ فرانس کی ثقافت میں اس طرح گھل مل جائیں کہ وہ خود کو فرانسیسی سمجھنے لگیں۔

استعمار کیوں تیار ہے کہ افریقائی برابر اور عرب کو جن کی نسل کی ہمیشہ تحریر کرتے ہیں اور انہیں صحرائی پوچھاتے ہیں، "فرانسیسی کہے؟" اور اس کا جی چاہتا ہے کہ اسے اپنی قومیت میں فرم کر لے، اسے اپنی برتر اور مالک نسل کا حصہ پہنادے، مگر وہ خود کو مسلمان محسوس نہ کرے؟

اس لئے کہ اس نے خود کو مسلمان محسوس کر لیا تو ایک مرتبہ خود کو کفر و تمدن و ثقافت وہی اور فطانت اور رزم کے ایک ہزار تین سو سالہ تاریخ سے متصل پائے گا اور اس پر سوار نہیں ہوا جا سکتا۔ ہذا اسے ثقافت سے عاری اور شخصیت سے محروم کرنا چاہیے۔ ایسا شخص، جس نے تازہ رسم اپنانے ہوں اور جس کی آرزو فرنگی

سے نزدیک ہونا ہو! ایک مسلمان جو اپنی فکری، تدفی، اخلاقی اور رسمیہ ثقافت، تاریخ، صنعت اور غنی و عظیم شخصیت کا احساس کرتا ہو۔ ہرگز فرنگی کا آہ کار نہیں بن سکتا۔

مگر افریقہ کے مسلمان جو لپٹنے آپ کو ایسے تدبی اور ایسے ماضی کا وارث محسوس کرتے تھے۔ استعمار انہیں رام نہیں کر سکا۔ فرنگی جلال و جبروت سے ان کی آنکھیں چند ہیانی نہیں اور استعمار کے خلاف جنگ مسلسل جاری رہی۔ ہر چند کہ وہ مختلف اور پر اگنده صورتوں میں تھی مگر پر اگنده اور ضعیف کیوں؟ اس لئے کہ ان کی ثقافتی و اسلامی خود آگئی کم در اور پر اگنده ہو گئی تھی۔ معاشرہ روایتی انحطاط پذیر ہو چکا تھا، یہاں تک کہ تین مساز مصنفوں کی تصدیق کے مطابق جہوں نے مسلمان افریقہ کی بیداری کی تاریخ لکھی ہے (یعنی فرحت عباس، عمر اوزغان اور ہمیزی مارٹینا) اگر ہم کسی ایسے دن کا تعین کرنا چاہیں جب شمالی افریقہ کی تحریک بیداری شروع ہوئی تو وہ وہ دن ہے جب محمد عبده مصر سے مغرب (یونان، مراکش اور الجبراہر) آئے انہوں نے نہ کوئی جلسہ بلا یا اور نہ کوئی اسلامی اٹھایا اور نہ ہی سیاسی جوڑ توڑ کروایا۔

محمد عبده آتے ہیں اور تمام علماء کو آواز دیتے ہیں اور کہتے ہیں ”فی الحال قدیم علوم کی تمام شاخوں کو چھوڑ دو اور صرف اور صرف قرآن کی آگہانہ تفسیر اور لوگوں میں قرآن سے آشنا کرنے میں مشغول ہو جاؤ۔

انسیوں صدی کے آخر میں ہبھلی بار قرآن شناسی کی یہ روایت علمائے اسلام کے روشن فکروں اور ترقی پسندوں میں راجح ہوئی، ورنہ قرآن جیسے کہ ہمارے درمیان معمول ارواج ہے۔ پڑھنے اور سمجھنے کے لئے نہیں ہے، اس کے معنی ہم پر

مختنی اور پوشیدہ ہیں، یہ قرآن کھل گیا اور یہ جامد یو نیور سٹیشن اور اسکول اور قدیم مدارس کے غبار آکوہ دروازے کھل گئے اور ایمان، تفکر، ذمہ داری، سیاسی اور اجتماعی شعور، انسانی خود آگاہی اور سمت یابی اور راہ یابی کی جانب تحریک شروع ہوئی۔

محمد عبدہ جو سید جمال الدین کی فکری تحریک کے نتیجے میں بیدار ہونے والوں میں سے ایک ہیں، ان کے ہاتھوں نئی باتیں اور جدید نظرے آئے۔ قرآن کی طرف واپسی کی تحریک کے فوراً بعد "جامعہ علمائے اسلامی" کی تشكیل ہوتی ہے۔ مذہبی بصیرت اور روشن خیالی کی اس تبدیلی کی انقلابی اور معاشرتی قدر و قیمت کا وہی شخص اندازہ لگا سکتا ہے جو استعمار کے ثقافتی نقصشوں کو خصوصاً انسیویں صدی میں ہمچنان لے۔ نیز فکری اور ثقافتی انقلاب کے اثر کو انقلاب اور اجتماعی بیداری پر مثلاً قرون وسطی کے یورپ کی نشانہ تانیہ اور پرتوسنت مذہب پر، اچھی طرح جان لے۔ یہ وہ صد اہے جو سید جمال الدین نے بلند کی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ شمالی افریقیہ کے معاشرے میں مذہبی بصیرت اور فکر کے اس دھمکے کے بعد مسلمان شمالی افریقیہ کی ثقافتی، اقتصادی، فوجی اور سیاسی تسلط سے نجات کے لئے پہلی سیاسی جماعت "سارہ شمالی افریقیہ" کے نام سے تشكیل پائی اور مذہبی محاڑ تھا جس نے بعد میں مختلف جماعتوں اور گروہوں کی شکل میں مسلح جنگ کا آغاز کیا اور اسے جاری رکھا ہے اب تک کہ شمالی افریقیہ کی مسلمان قومیں آزاد ہو گئیں۔ افریقیہ کے مسلمان معاشروں کے آزاد ہونے کے بعد ہی افریقیہ کے سیاہ معاشروں کی آزادی کا آغاز ہوتا ہے۔

اب اس سوال پر بحث ہونی چاہیے کہ استعمار کے خلاف آزادی بخش جنگ میں مسلمان قومیں کیوں غیر اسلامی قومیں پر مقدم ہوئیں؟ ایک ہی برا عظیم میں ہے چہلے کیوں بیدار ہوئے اور ان سے پیشتر فرانس اور انگلستان کے خلاف امداد کھڑے ہوئے اور مغربی طاقت کے اثر میں بھی دری سے آئے؟ مسلمان جو مغربی ثقافت و تمدن کی یورپ کے مقابلے میں کھڑے ہوئے، اس لئے کہ ان کی ایک عظیم معنوی اور ثقافتی بنیاد تھی جس کی انہوں نے حفاظت کی تھی اور یہ عظیم اسلامی ثقافتی بنیاد ہے جو ایک تعمیری، طاقتور اور فکر، روح اور جذبہ کو حرکت میں لانے والی ثقافت ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک مسلمان اس ثقافت کے سلسلہ میں اپنی معاشرتی ذمہ داری کا احساس نہ کرے۔

اسلامی ثقافت بودھ، وید کی طرح یا، صیہانی، ذرتشی اور مانوی مذہبوں کی طرح ایک روحانی اور اخلاقی اور مادوائے طبیعی طبیعی ثقافت نہیں ہے، بلکہ ایک معاشرتی، سیاسی، رسمیہ اور ذمہ داری کی ثقافت بھی ہے۔

ایسا قرآن جو تمام مذہبی، فقی اور سمحی احکام سے زیادہ جہاد کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور وہ پیغمبر جس نے اپنے معاشرے کے لئے تمام عمر دشمن کے خلاف سیاسی اور فوجی جہاد میں گذاری ہو، اور جس نے مدنی زندگی میں اوسٹھا ہر پچاس دنوں میں ایک فوجی کارروائی کی ہو، اسلام کی تاریخ جو جہاد، رزم اور طاقت کی تاریخ ہے، کس طرح ممکن ہے (ان حقائق سے) ایک آگاہ مسلمان کو جمود، غلامی، سیاسی ذلت اور نشے کی حالت میں رہنے دے، وہ اسلام جس پر یہ الزام ہے کہ یہ تلوار کا دین ہے وہ ان ادیان سے مختلف ہے، جو نشہ اوری کے دین ہیں۔ انسیوں صدی میں یعنی

انسیوں صدی کی تیسری چوتھائی میں تمام اسلامی معاشرے مختلف پختہ و ناپختہ صورتوں میں عوام کی طرف سے اور علمائے اسلام کی رہبری میں استعمار کے تسلط کے خلاف متحده شورش و بغاوت کی حالت میں رہے ہیں۔ خود ایران میں تباہ کو کی تحریک جس کی اہمیت ہم درست طور پر نہیں پہچانتے۔ یہ تحریک آقا میرزا حسن شیرازی کے مخصر سے فتویٰ سے آغاز ہوتی ہے۔ یہ ہے میرزا حسن شیرازی کا فتویٰ: ”آج کے بعد، تباہ کا استعمال جس شکل میں بھی ہو، امام زمان سے جنگ کا حکم رکھتا ہے۔“

دیکھئے اسلام میں کس طرح سے دین اور دنیا قابل تلقیک و جدا نی نہیں ہے اور قطعاً قابل تشخصیں نہیں۔ استعمار نے ہمارے منہ میں یہ بات ڈالی کہ مذہب زندگی سے جدا اور ہمارے روشن خیالوں نے بھی طوٹے کی طرح سے اس کو دھرا یا، اس خیال سے کہ کلیسا کے مقابلے میں یورپی روشن خیالوں کی تقلید کر ہے ہیں۔ وہ اس بات سے غافل تھے کہ یہ قبیس سوں الفارق ہے۔ ایسا بڑے آدمی گاندھی کی ”منفی مقابلے کی تحریک“ جو تحریک تباہ کو کے تھوڑے عرصے بعد واقع ہوئی، اسی تحریک کے تحتِ اثر واقع نہیں ہوئی ہے۔ میرزا کی اقتصادی استعمار کے خلاف تحریک وہ استعمار جو رژی کمپنی کی شکل میں (ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرح سے) ایران میں داخل ہوا، تباہ کو حرام قرار دینے کی تحریک اور رژی کمپنی کے خلاف مزاحمت کے بعد گاندھی نے انگلستان کے خلاف منفی تحریک اور انگلستان کے بنے ہوئے کپروں اور سامان کا تمام ہندوستان میں بائیکاٹ کا اعلان کیا اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خالی ہاتھوں سے برطانیہ عظمی کی سلطنت کو احتیار ڈالنے پر مجبور کر کے دشمن

کے ہاتھ کاٹ دیئے اور انگلستان نے اپنی طاقت کے معراج کے زمانے میں اس زرخیز برا عظم (بر صغیر) کو پہنچ ہاتھ سے کھو دیا۔

استعمار اس وقت اپنی زندگی کو برقرار رکھ سکتا ہے اور ترقی کر سکتا ہے جب مقامی لوگ اس کی مصنوعات کے امکنث اور اس کے مال کے صارفین بنیں۔ اگر یہ مزاحمت کریں، متحد ہو جائیں، اور اپنی مصنوعات کو استعمال کریں، استعمار مر جاتا ہے چنانچہ انہوں نے پہلے ہمیں جدت پسند بنایا، پھر ہم پر سوار ہو گئے۔ ایران میں آئینی حکومت کی بیداری کے آغاز کے نشانات کو انسیویں صدی کے اوامر میں جستجو کرنا چاہیے۔ ایران میں انصاف کا مطالبہ، آئینی حکومت، اور انفرادی استبداد کو رد کرنے کا اعلان انسیویں صدی کے اوامر میں ہوا اور یہ سب عظیم ترین انقلاب سے ہے لیکن کہ آئینی حکومت کی تحریک تمام تر ایک سیاسی مسلح جنگ کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔ ہر مسلح انقلاب کے پیچے ایک لکری اور ثقافتی تحریک ہوتی ہے، جس سے انقلاب جنم لیتا ہے۔

انسیویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں تمام مسلمان افریقیہ (شیونس، الجزائر، مراکش، مصر، سوڈان وغیرہ) نے مسلح اسلامی متحده بغاوتوں اور یورپی سپاہیوں پر حملوں کی صورت اختیار کر لی۔ بر صغیر ہند میں بھی اگرچہ سیاسی اور فوجی نگاہ سے یہ تاخیر سے ہوئی، لیکن اس میں انقلاب کے خمیر اور پیدائش کی ایک رو کو اسلامی ثقافت میں ڈال دیا گیا، جو عینی اور قابل مطالعہ و عنور ہے۔ وہ چیز جس نے ہندوستان کی استعمار دشمن تحریک کو توانائی اور معنوی و روحانی غذا دی اور اس کے لئے پس منظر فراہم کیا۔

گر اس وسیع علاقہ میں پھیلے ہوئے اسلامی ملکوں کی، جہاں اسلامی ثقافت حکمران ہے، یہ بغاوتیں، یہ سب انقلاب اور داعیی بیداری، ان لوگوں کی مرحوم منت ہے، جنہوں نے آخر صدی میں زمانے (کی مخالفت) اور مشکلات کے باوجود اسلامی ثقافت کی تعمیر نو، اقبال کی اصطلاح میں یا جدید زمانے کی اصطلاح کے مطابق "تجدید ولادت" کی ان لوگوں نے مکتب اسلام کے جدا جدا ہوئے نکزوں کو الگ الگ حل کر کے اور ان کی نشووناکر کے شروع سے اور جہل کی طرح دوبارہ افکار کی صورت میں سب کو مستلزم اور مدون کیا اور دکھادیا کہ یہ ہے فکر اسلامی کا مکمل اور کامل پیکر اور یہی تھے اسلام کے باخبر مفکرین اور علماء۔!!

سید جمال الدین نے جو نشانہ ثانیہ اسلام کی تحریک اور بقول اقبال "بنیاد فکر اسلامی کی تجدید" کے اولین بانی تھے۔ جو نام اس تحریک کے لئے منتخب کیا ہے "تحریک سلفیہ" تھی، یعنی وہی گذشتہ زندگی کی طرف واپسی کی تحریک یا ہمہ لفظوں میں آج کے مردہ اور بے حس و حرکت جسم میں دوبارہ پہلی جیسی زندگی لانے کی تحریک۔ یہ ولادت کی تجدید ہے۔ ایک انقلابی، مترقب تحریک، موجودہ یوسیدی، نش آوری، خوابیدگی، موت، توقف اور انحطاط جو (امراض) ایک سحرک معاشرے اور قوت بخش اور مترقب مذہب کو عارض ہوئے ہیں ان کی مخالف تحریک۔

کیا (یورپ) کی نشانہ ثانیہ کی فکر جو کلیسا، اور مکتبی اور قرون وسطی کے پر جمود و اختناق حالات کے خلاف اور یونان کے سہرے مقتدر زمانے کی طرف واپسی کا اعلان تھی، ایک رجعت پرستاہ تحریک تھی؟

ظاہری، رسمی اور فوری طور پر فیصلہ نہیں کیا جانا چاہیے۔ واپسی کی ہر

تحریک، پرانی، فرسودہ اور رجعت پر سانہ تحریک نہیں ہوتی۔ وہ پہلے معاشرے اور قومیں جو استعماری تمدن اور ثقافت کی قدریوں اور مغرب پرستی کی بیماری کے باوجود یورپ کی زبردستی مسلط شدہ تمدن کے فضائل کے خلاف، ڈنی رہیں اور ان سے جہاد شروع کیا، مسلمان معاشرے اور قومیں تھیں اور استعمار اور مغرب زدگی کے نقطہ آغاز سے غیریورپی، استعمار زدہ اور مغرب پرستی کی ماری دنیا نے اپنی خودی اور مغربی ثقافتی قدریوں کی ننی کرنے کی تحریک کا آغاز کر دیا تھا۔

یہ گذشتہ صدی خصوصاً دوسری جنگ عظیم کے بعد کا واقعہ ہے کہ افریقہ اور لاطینی امریکہ کے رہنماؤں اور عظیم مفکروں کی بڑی تعداد نے مثلاً احمد سزرا، علیون رسپ، سکور، فرانتیفانوں، میکور را وحکار کر شان اور سن یات سن نے یورپی تمدن کی ثقافتی قدریوں پر حملہ کر دیا اور ہا کہ مغربی تمدن عظیم ترین اور تہنا انسانی تمدن نہیں ہے۔ ہماری بھی ثقافت ہے۔ قومی اور ملی ثقافتیں ہیں اصلی مذاہب ہیں اور فنون کی قدریں ہیں۔ لیکن اس وقت تک تمام مقامی قومیں، بہاں تک کہ تاریخی طور پر ممتدن معاشرے اس بات پر قائم ہو چکے تھے کہ عظیم ترین درخشنان تمدن اور جدید ترین انسانی قدریں بلا مقابل مغرب کی قدریں، تمدن اور ثقافت ہیں

مسلمان مفکر اور یہ ترقی پسند اور استعمار شکن علمائے اسلام وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایک تنقیدی روح، ایک منفی نقطہ نظر کے جذبے کے ساتھ خطرے کا اعلان کر کے اس کے مقابل ڈالنے رہے اور خودی کی طرف والپی جو عصر حاضر میں "کالوں کی کانگرس" یا احمد سزرا اور سکور، اور جو لیں نیڑہ جیسی شخصیات نے دنیا میں اعلان کیا ہے، تو سو سال سے زیادہ عرصہ گزارا ہے کہ مغرب کے تمام دھنست ناک

اور تباہ کن تمام چہروں کے جملہ، اقتصادی، فوجی مغرب اور مغرب کے خطرناک ترین چہرے یعنی مغرب کے لکری استعمار کے خلاف اسلامی ملکریں نے اعلان کر دیا تھا۔

جی ہاں مغربی استعمار کا خطرناک ترین اور اسی فصل میں سب سے زیادہ شہچانا ہوا، اور سب خنی چہرہ اس کی ثقافتی اور لکری استعماریت ہے جو ہبھلے فکر، تعصب اور تعمق کو ختم کر ڈالتی ہے، دین کے متعلق ہمارے طرز تفکر کو بدل دیتی ہے اور غیر یورپی معاشرے کے اندر اور ان کے اذہان میں اپنے اثر و سوخ اور استقرار کو کوٹ کر ہموار کر دیتا ہے اور اس کے عقب میں اقتصادی اور فوجی جملہ لے آتا ہے۔ اگر ثقافتی استعماریت کا وجود نہ ہوتا تو راستہ کھلاش ہوتا۔

ہبھلی بار روشن فکر مسلمان ہی تھے کہ جہنوں نے استعمار کے کمر وہ چہرے سے اس ثقافتی روشن لکری اور متدن کے نقاب کو اٹھایا، وہ ثقافتی استعماریت کہ جس کا کام ثقافت کا خاتمه، مذہب کی نفی، معنویت روح اصالت کو مٹانا اور معاشروں میں اخلاقی اور مدنی فضائل کی غارت گری تھا۔ جہنوں نے ہبھلی بار یہ محسوس کیا کہ مغربی استعمار کے جملے کے خلاف کھڑا ہونا چاہیے اور یہ وجہ ہے کہ الجزائر کے علمائے اسلام نے شعوری طور پر جہاد میں اس نعرہ کو اپنا عنوان بنایا کہ ”اسلام دیننا و الحربیتی لساننا، والجزائر وطننا“ (اسلام ہمارا دین ہے۔ عربی ہماری زبان ہے اور الجزائر ہمارا وطن ہے)۔ اس واسطے کہ وہ لوگ اس موقع پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ فرانس اس لئے نہیں آیا ہے کہ جدید متدن لے آئے اور جدید مصرف لائے اور یہاں تک کہ صرف مادی مفادات حاصل کرے اور شروت و دولت کے ذرائع کو لوٹ

لے، نہیں بلکہ وہ اس لئے آیا ہے کہ انسان کو سچ کر دے اور تاریخ کو بدل دے اور سب انسانی قدروں کو فنا و نابود کر دے۔ انہوں نے اس بات کو محسوس کیا۔ یہی وجہ ہے کہ فرانسیسی استعمار یہ کہتا ہے فرانسیسی آپ کی زبان ہو اور فرانسیسی آپ کی قومیت ہو، اور کوشش کرتا ہے کہ عیینائیت آپ کا دین ہو، اور یہ محسوس کرتا ہے کہ استعماری نعروں کے ساتھ ان نعروں کو بلند کرنا چاہیے۔

یہ ہے روشن خیال، استعمار کے خلاف ترقی پسند سیاسی اور استعماری اور معاشرتی آگاہی رکھنے کا مطلب، شاید کہ مغرب سے جو کچھ بھی برآمد کیا جائے اسے طوٹے کی طرح روشن خیالی کے نام پر تربجہ کرنا، اور آج وہ دن ہے کہ جوان روشن فکر و نظریے کے بعد استعمار زدہ دنیا، خصوصاً افریقیہ میں اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور استعمار کے ثقافتی محلے اور لوٹ مار کے خطرہ کا اندازہ کر لیا ہے۔ یہ وہ اصول ہے جس کے پیچے افریقیہ کے کالے اور لاطینی امریکہ کے روشن خیال رہنمائی لگ لے ہوئے ہیں۔

نیویہ مشرقی افریقیہ کے معاشرہ شہاسروں، رہنماؤں اور مفکروں میں سے ایک ہے۔ اس کی اپنی اور اس کے معاشرے کے تمام تعلیم یافتہ اور روشن خیال افراد کی زبان انگریزی ہے۔ اس نے کیمبریج میں تعلیم حاصل کی ہے اور لندن میں بھی کچھ سیکھا ہے مگر اس کے ملک کے عوام اور ان پڑھ لوگوں کی زبان "سو احلی" ہے۔ اس بنابر اس نے اعلان کیا ہے کہ سوا احلی زبان، جو اگرچہ ایک نیم وحشی مقامی اور انحطاط پذیر زبان ہے اس کو اپنی یونیورسٹیوں کا بلوں اور مدرسوں میں تحقیقی، علی اور سیاسی انجمنوں اور اداروں میں انگریزی کی جگہ لایا جائے۔

یہ ایک اہتمائی ترقی پسند اور روشن خیال شخص کا طرز تفکر ہے۔ جبے دنیا ایک انقلابی عنصر کے طور پر جانتی ہے۔ وہ تمام افراد جو بیسویں صدی کے انقلابی راہنماؤں کے طور پر بہچانے گئے ہیں، اور روئے زمین پر مغضوب اور معتوب حلقوں سے والبستہ ہیں، انہوں نے اس اصول کو اپنانہ بنا یا ہے۔ ”مغرب کی ثقافتی قدروں اور قابوں کو مسترد کر دینے اور اپنی حقیقت، اصالت اور ثقافتی قدروں کی طرف واپسی کا اصول۔

آپ ان تمام تحریکوں کے درمیان میں جو ثقافتی اور ہمہان تک کہ سیاسی اور اقتصادی طور پر مغربی استعمار کے خلاف رو عمل کی صورت میں وجود میں آئیں اور جہاد اور بغاوت کو وجود میں لائیں، ترقی پسند، شجاع اور آگاہ علماء کے چہروں کو دیکھتے ہیں۔

بے شک بغیر استثنائے میں یہ بات ایک مسلمان یا مذہبی مسلح کے طور پر نہیں کہتا، بلکہ یہ ایک تاریخ اور معاشرتی علوم کی حقیقت ہے۔ مجھے روشن خیال افراد کے اس گروہ سے کوئی کام نہیں، جو مذہب اور علمائے اسلام کے بارے میں وہی درآمد شدہ یورپی فیصلے کرتے ہیں جو قرون وسطی کی عیسیائیت اور کیتھولک مکتب کے متسلق کئے گئے تھے اور ان کو دہراتے ہیں۔ البتہ وہ لوگ جن کے فیصلے ان کا اپنا کام اور آزاد اور مستقل افکار اور براہ راست ان کی اپنی تحقیقیں اور شاخات سے نکلے ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ گذشتہ سو سال کے سیاسی انقلابیوں اور تحریکوں میں علمائے دین، مذہب اور مسجد و بازار کا کیا کردار رہا ہے اور انہیں یہ جانتا چلہیے کہ اسلام میں عیسیائیت کی طرح روحاںیت کا کوئی آزاد شکل یافتہ ادارہ نہیں ہے کہ جس کے

متعلق کوئی عام فیصلہ کیا جاسکے۔

اسلام میں علماء عام لوگوں اور معاشرے میں سے تدرقی برگزیدہ افراد ہیں اور ہر ایک کی اپنی آزاد شخصیت ہے اور اس بنابر اسلام میں "روحانیت" کے نام پر کسی "ہذا معاشرے" کے متعلق گفتگو کرنا اور اس کے متعلق فیصلہ صادر کرنا سخت جاہلائی بات ہے ، لیکن باوجودیکہ ان میں انحطاط پذیر، پست اور حتی استبداد فناہی سے وابستہ افراد موجود ہے ہیں۔ اس کے باوجود ان کا مقابلہ یورپ میں قرون وسطی کے روحانیت کے ادارے سے منطبق نہیں ہے اس لئے کہ دونوں دونوں دو غیر مشابہ اور غیر ہم جنس معاشرتی حقائق ہیں۔

میں جو یہ کہتا ہوں کہ تمام استعمار دشمن اور یورپی ثقافتی مخلوقوں کی مخالف تحریکوں کے اندر جو روح اور رہبری موجود رہی ، وہ علماء اور بڑے اسلامی مفکروں کے ہاتھ میں رہی اور حتی کبھی انہوں نے اس کو اصول بنایا ہے ، تو یہ ایک عینی حقیقت ہے۔

ان تمام اسلامی معاشروں کو جو گزشتہ سو سال میں جدید تدن سے آشنا ہوئے اور انہوں نے یورپ کے اقتصادی سیاسی اور فوجی مسائل سے سروکار پیدا کیا ، لگاہ کریں ، ان سیاہ مجاہدوں کو جو گذشتہ ایک صدی یا ایک صدی سے زیادہ میں تدوین کئے گئے اور یہ منہوس استعماری مجاہدے جو افریقی اور ایشیائی اسلامی ملکوں اور استعمار کے درمیان منعقد کئے گئے ، یعنی زبردستی ان پر ٹھونے گئے ، کسی ایک مجاہدے کے نیچے کسی ایک بھی عالم دین کے دستخط موجود نہیں ہیں۔

افسوس اور اہمیتی شرمندگی کی بات ہے کہ یہ سب کے سب دستخط جدید

تعلیم یافتہ اور "روشن خیال" ، "آج کے" ، "غیر متعصب" اور "غیر مقید جہان شناسی رکھنے والے اور فلسفہ مرکوزت انسان کے حامل ترقی پسندوں اور غیر مذہبی افراد کے ہیں۔

یہاں تک کہ اگر ان علماء کے درمیان سے ایک عالم یہ چاہتا کہ خود کو یقین دالے اور "استعماری معاہدے" پر دستخط کرے، تو چہلے عمامہ و قباد عبا کو اتار لیتا، اور داڑھی صاف کر لیتا اور ہیث ہمین لیتا، یورپ کا ایک سفر کرتا اسے دریائے شیز میں "غسل تعمید" (دین، مسیحیت میں داخل ہونے کے لئے غسل) کرایا جاتا، اس کے بعد واپس آتا اور (استعماری) فصل کا آئلہ کار اور آخر کار ایک جدید نئے، ترقی پسند، یورپ نواز، غیر مذہبی شخصیت کے طور پر دستخط کر دیتا تھا۔

یہ اسلامی مفکر اور راہنمائی تھے کہ سب سے زیادہ انہوں نے خود اور اسی طرح اپنی روحانی، مصنوی اور مذہبی زبان میں، جس کے ذریعہ وہ لوگوں اور اپنی نسل سے فکری تفہام اور تبادلہ خیالات رکھتے تھے، (بر عکس جدید یورپی روشن خیالوں کے)، اس خطرے کا اعلان کیا کہ یورپ اسلئے نہیں آیا ہے کہ صرف اور صرف تکنیک، تیل، روئی، پیٹ سن کو لوئے اور نیز زمین ذخائر اور گران بہا معدنیات پر ڈاکہ ڈالے بلکہ بیک وقت وہ ہماری تمام انسانی ثقافتی سرمایہ، اخلاقی فضائل اور روایتی، مذہبی اور روحانی ہر ہیوں، شخصیت اور تاریخ کو، نیز ہر اس چیز کو جو ہماری قومی وجود کو بناتی ہے، جبکہ کرتا ہے، لوٹ لیتا ہے اور اسے گندی دلدل میں کھینچ لاتا ہے۔

پہلی بار یہ لوگ تھے جو استعمار کے مقابل ڈٹے رہے اور استعمار کے خلاف قومی تحریکوں کے راہنماؤں کے بر عکس، استعمار کے خلاف جہاد کو فقط اقتصادی اور

سیاسی میداونوں تک محدود نہیں کر دیا، بلکہ ان کی ایک لکری، نظریاتی اور معنوی بنیاد اور حامی بھی تھے اور انہوں نے استعمار کو اس کے تمام چہروں کے ساتھ ہچان لیا تھا اور خاص طور پر اس کے جملے کے مختی ترین اور مہیب ترین بازوؤں یعنی لکری، معنوی، اخلاقی اور علمی بازو یعنی اس کی ثقافت سے لہو پڑے تھے۔ یہ لوگ مغرب کے مقابل ثقافت اور لکر کے اسلحے کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ علامہ اقبال جب مغربی تمدن پر حملہ کرتے ہیں۔ تو وہ ایشیائی اور افریقی ممالک کے ایک قوم پرست استعمار دشمن کے علاوہ دوسری شخصیت ہوتے ہیں جو مغرب پر حملہ کرتے ہیں تاکہ خود کو اس کے سیاسی و اقتصادی تسلط سے نجات دے سکیں۔ وہ انسان کی راہنمائی کے مدعا ہونے کی حیثیت سے مغرب اور مغرب کے تمدن و ثقافت و لکر پر حملہ کرتے ہیں۔ ان لوگوں پر جو انسان کے دشمن ہیں۔ اس تمدن پر جو یہ چاہتا ہے کہ تمام دوسرے تمنوں اور ثقافتوں کی ننی کرے۔ ان کا الٹا کرے اور انہیں پامال کرے۔ وہ زندگی کے اس طرز اور اس لکر پر جو بنیادی طور پر انسان دشمن ہے مغرب پر حملہ کرتے ہیں، ایک قیدی کے طور پر نہیں جو حدود چمد کرتا ہو، کہ خود کو مغرب کی قید سے نجات دے۔

اسلامی معاشروں اور آگاہ و بیدار مصلحین کے ترقی پسند مکاتب میں استعمار کے خلاف جہاد اور مغرب دشمن بصیرت کا دامن وسیع ہے۔ یہ ایک کھلی اور روپہ ترقی بہان بینی پر قائم ہے۔ اس کی بنیاد ایک انسانی نظریاتی بصیرت پر ہے نہ کہ ایک محدود قوم پرستانہ اور سیاسی رجمان پر۔

وہ چیز ہے اور زغان، کاتب یاسین، امہ سیر، علیون دیپ، جولیس نیرہ اور

سکور جیسے بڑے معاصر مفکرین سمجھے گئے ہیں اور ان کے افکار کا ترجمہ آخری دو تین سال کے روشن خیالوں کے لئے بڑا ہنگامہ خیز رہا ہے، وہ سید جمال الدین کے زمانے سے کو اکبی اور اقبال تک ہمارے آگاہ مفکروں کے درمیان کام کی بنیاد کے طور پر زیر بحث رہی ہے۔ لیکن افسوس کہ یہ ہم سے منسوب ہیں اور ہم آدھے تو مومن اور یخیل اور بظاہر مقدس ہیں اور دوسرے آدھے غیر مذہبی اور جدت پرست اور مشہور قول کے مطابق روشن خیال ہیں اور وہ فرنگی تراجم اور یورپ سے درآمدہ افکار سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتے اور ان میں تشخیص اور آزاد شاخت کا فقدان ہے۔

اسلام اور اسلامی ثقافت نے ہر ملت و مذہب سے زیادہ استعمار سے زک اٹھائی ہے۔ استعمار کے مارے ہوئے معاشروں کے ہر مکتب و مسلک سے زیادہ استعمار کے خلاف لڑے ہیں۔ ہمارے معاشروے میں کچھ لوگوں نے چونکہ ادھر ادھر سے یہ سن رکھا ہے کہ یورپ میں مذہبی روشن خیال نہیں ہیں یہ سوچا ہے کہ انہیں بھی مذہب کا مخالف ہونا چاہیے اور جو کوئی بھی مذہب یا کسی بھی مذہب کی کسی بھی زمانے اور صورت میں مخالفت کرے۔ ایک یورپی روشن خیال بن جاتا ہے۔ یہ سبب ہے کہ میں بارہا ایک ایسے نظریے کو زیر بحث لایا ہوں جو اصلی روشن خیالی کی بنیادوں میں سے ہے، مگر اس نے بغیر پڑھے اور بغیر سنئے اور سمجھئے اس کی مخالفت کی ہے صرف اس بنا پر کہ یا تو اس میں اسلام کا نام لیا گیا ہے یا صرف اس وجہ سے کہ اس نے یہ سننا کہ میں مذہبی روحان رکھتا ہوں۔ میری زیادہ تر کتابوں کو ان لوگوں نے جلد دیکھتے ہی مسترد کر دیا ہے!

سب سے مزے کی بات یہ ہے کہ ایک روشن خیال نے ہو میری دلیل کو رد نہیں کر

سکتا تھا اور اس نے ناچار قبول کر لیا تھا، لیکن یہ کہا آپ کی یہ بات کہ اگر ہم اپنی ثقافت اور روپہ ترقی اسلامی فکر کی بنیاد کی طرف واپس چلے جائیں، ہمارا معاشرہ آزاد اور ارتقاء یافتہ شخصیت حاصل کر لے گا درست ہے اور آپ یہ جو کہتے ہیں کہ یہ جو موجود ہے وہ خرافات ہے جو سُخ شدہ اسلام سے مخلوط ہو گیا ہے یعنی ہے اور یہ جو آپ کہتے ہیں کہ حقیقی اسلام ایک زندگی بخش، معاشرتی اور آگھی بخش اور روپہ ترقی مذہب ہے اور اگر اس کی روح اور ثقافت کی، جو ہمارے درمیان ہے، احیاء کی جائے تو ہم مغرب کی یورش کے خلاف کھڑے ہو سکتے ہیں اور انسانی اور معنوی آزادی بھی حاصل کر سکتے ہیں اور عوام کو ہونڈ بھی ایمان رکھتے ہیں اس طاقت کے ذریعے حرکت اور بیداری کی ترغیب دے سکتے ہیں، یہ بھی یعنی ہے، اور ہم قبول کرتے ہیں کہ اسلام حقیقت ہے اور وہ بھی ایک لازم، ضریب اور ہماری ضروریات کے مطابق حقیقت لیکن کب تک ان گمراہ کن افکار اور موجودہ مخلوط اسلام کو الگ کر کے حقیقی اسلام کو زندہ کر سکتے ہیں۔ یہ کام بہت مشکل ہے۔ ہر نہیں کہ ہم کہیں کہ سرے سے دین ہی کو ایک طرف رکھ دیں اور پھر جب اس کو ایک کونے میں رکھ دیں، تو لوگوں سے صاف اور سیدھے سیدھے کہہ دیں "راستے یہ ہے اور کنوں وہ رہا؟" میں نے اس سے کہا اس وجہ سے کہ کوئی کام "مشکل" ہے، کوئی سبب نہیں کہ ہم اس کو چھوڑ دیں۔ اگر کہتے ہو کہ اسلام درست ہے، حقیقت رکھتا ہے، ایک روپہ ترقی، قیمتی اور واقعی فکر ہے، تو ہم خود مکوند اس کے معتقد ہو جاتے ہیں۔

یہ نہیں ہو سکتا کہ میں کہوں جتاب میرا ایک دین ہے، ایک مکتب ہے، جو درست ہے، واقعی اور علمی حقیقت ہے، لیکن میں اسے مسترد کرتا ہوں اور قبول نہیں کرتا جو نکہ موجودہ معاشرے اور حالات کے اندر اس کا احیاء اور اجرا، مشکل ہے

اور بہت لمبا عرصہ لگتا ہے۔ لہذا ناچار اسے جڑ سے مسترد کر دیتے ہیں اور ایک ایسی فکر اور کسی دوسرے اعتقادی کتب کے پیچھے جاتے ہیں جو آسان ہو، اور جسے جلدی سے رانج کیا جاسکتا ہو!

آپ مجھ سے کہتے ہیں "بیسویں صدی میں جو بے دینی کی صدی ہے، کیا اس میں دین کے رک्टے لوگوں کی اور ملت کی خدمت کی جاسکتی ہے اور معاشرے کی اصلاح اور موجودہ معاشرتی حالت میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے اور فکر کو بیدار کیا جاسکتا ہے؟

غیب بات ہے! کتنی بڑی غلطی ہے؟ بیسویں صدی سے مجھے کیا۔ ہمارے روشن خیال تقویٰ زمانے اور معاشرتی زمانے کو ایک سمجھتے ہیں! تقویٰ نقطہ نظر کی رو سے تمام انسان جو اس وقت سانس لے رہے ہیں ہم عصر ہیں اور بیسویں صدی میں زندہ ہیں۔ لیکن سب کے سب بیسویں صدی میں زندگی نہیں گزار رہے۔ مہلا کام جو ایک اصلی روشن خیال (ان اس مقلد کے تز جوں کی ادائیں رکھنے والے) کو کرنا چاہیے یہ ہے کہ لپٹے معاشرے کے "معاشرتی زمانہ" کا تعین کرے، یعنی اس بات کو سمجھئے کہ اس کامعاشرہ کس مرحلہ اور کس صدی میں زندگی گزار رہا ہے۔ اسی بیسویں صدی میں بہت سے معاشرے ایسے ہیں کہ تاریخ میں داخل نہیں ہوئے اور تاریخ سے قبل دور میں زندگی گزار رہے ہیں۔

یہ بہت سادہ لوٹی ہو گی کہ ہم خیال کریں کہ مثلاً ایک ایسا معاشرہ جس میں جاگیر دارانہ نظام ابھی تک موجود ہے اور ابھی اس کی مشکلات عام جہالت یعنی رسم الخط کا شہ ہونا اور آئین اور معاشرتی جمہوری رو بہ ترقی اداروں کا شہ ہونا ہوں، بیسویں

صدی میں زندگی گزار رہا ہے اور اس جگہ میں ہم دفتر شاہی " جمہوریت ، نظام مشین سرمایہ داری ، پرولتاری طبقے اور فلسفی نافرمانی اور عالمی طبقے اور دیگر بیویں صدی کے معاشرے کے خاص مسائل پر گفتگو کریں ।

بیویں صدی کا معاشرہ ا مجھے تو پہنچے معاشرے کی صدی سے کام ہے ۔ مجھ روشن خیال کو یہ فراموش نہیں کرنا پڑا ہے کہ نہ تو میں انسیویں صدی کے جرمنی میں ہوں اور نہ بیویں صدی کے فرانس میں اور نہ پندرہویں اور سو ہویں صدی کے اٹلی میں ، میں مشہد ، تہران ، اصفہان ، تبریز ، قم اور خوزستان میں زندگی گزار رہا ہوں ۔ یہ ایک حقیقت ہے ۔

حقیقت پسند ہونے کے ہی معنی ہیں کہ معاشرتی فیصلوں کو دنیا کے روشن خیالوں کی کتابوں سے نہیں ، بلکہ عوام الناس کے درمیان سے نکال کر لانا ، کتاب کے تن کو نہیں لوگوں کے تن کو پڑھنا ، مجھے اس سے کیا کام کہ صدی غیر مذہبی ہے میرا معاشرہ ایک مذہبی معاشرہ ہے خواہ میں مذہبی ہوں ، خواہ مذہبی نہیں ہوں ( افادی فلسفی کی بصیرت کے طور پر ) اگر میں روشن خیال ہوں تو مجھے اس معاشرتی اور معاشرتی علوم کی عینی حقیقت کا معرفت ہونا پڑتا ہے ۔

ہمارے زیادہ تر روشن خیال اپنے ذاتی عقاید کو معاشرتی حقائق سے خلط ملط کر لیتے ہیں چونکہ وہ خود مذہب کے مخالف ہیں تو معاشرتی اور سیاسی کاموں میں بھی معاشرے کو مذہب کا مخالف گردانہ ہے ۔ حقیقت پسند روشن خیال معتقد تصوریت نہیں ہوتا ہے یعنی وہ شخص جو اپنے اندر وہی عقیدے اور ذہنی رہمان کو معاشرے کی عینی حقیقت سے نہ سمجھ بیٹھے ۔

میں دیکھتا ہوں کہ میری ملت کی معاشرتی روح مذہبی ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ استعمار اور اس کے امپنٹ کبھی تو اس پر انحصار کرتے ہیں اور کبھی اس کے خلاف شدید جنگ کرتے ہیں ۔

انگریزی استعمار کا بانی قرآن کو زمین پر مار کر چیخا، کہ "جب تک یہ کتاب موجود ہے مسلمانوں کے درمیان ہمارا اثر و نفوذ محال ہے ۔" میں جانتا ہوں کہ ترقی پسند روشن خیال کو اپنے معاشرے کی ثقافت، روح اور شخصیت پر اعتماد کرنا چاہیے اور اس مقام سے اپنی تحریک کا آغاز کرنا چاہیے، میں جانتا ہوں کہ ہماری قومی ثقافت ایک اسلامی ثقافت ہے ۔ جانتا ہوں کہ اسلام (مذہبی نقطہ نظر سے اس پر ایمان رکھوں یا نہ رکھوں) معاشرتی، سیاسی اور طبقات و شمن عناصر سے پر اور اس کے پاس دنیا کی بصیرت اور ہجہاد و رزم کی ثقافت ہے ۔

اس بنا پر میرے معاشرے میں اسلام عوام کا ایمان بھی ہے ، معاشرتی مصبوط قوت ہے اور تاریخ بھی ہے اور قومی ثقافت بھی ہے اور اپنی ذات میں یہ تعمیری، آگہی بخش، عدل پسند، استبداد و شمن اور اپنے پیروؤں کی انسانی، معاشرتی اور مادی عرت و حرمت کا بھی معتقد ہے ۔ ان حقائق کے نہ سمجھنے کا مطلب کسی چیز کو بھی نہ سمجھنا ہے ۔

اگر میں جو روشن خیال ہوں، اس عظیم اور لبریز ثقافتی منع کو باہر نکال کر لاسکوں، اگر ان لوگوں کو جو اسلام پر ایمان رکھتے ہیں ۔ اسلامی آشنائی اور آگہی فراہم کر سکوں اور اگر ان کی آنکھوں کو بھی ان دلوں کی طرح اس پر رزم و حرکت مکتب کی تاریخ کے بارے میں جو حرکت اور زندگی کے شعور سے لبریز ہے کھوں سکوں، تو میں

نے ایک روشن خیال مفکر ہونے کے ناطے اپنا فریضہ منصی ادا کر دیا۔ روشن خیال مفکر کا اس کے علاوہ کوئی فریضہ نہیں کہ کسی معاشرے کی معنوی اور قومی ثقافت اور شخصیت کی بنیاد پر اس کو طبقاتی یا قومی خود آگئی و شور عطا کرے۔ سیاسی راہبری لوگوں کا اپنا کام ہے۔

دیکھئے کہ روشن خیال مفکروں کے اس دماغ نے ہمیں کس طرح کا بنا دیا ہے کہ جب میں ابوذر کی بات کرتا ہوں، جہوں نے طبقات و شمن کا اور آج کی حقیقی اور علمی معنوں میں انقلابی اور استبداد شکن اور سرمایہ داری کے خلاف سب سے زیادہ ترقی پسند انقلاب کو تاریخ اور مذہب میں شروع کیا تھا جب میں علی کی بات کرتا ہوں جو آزادی اور انسانی رزم، عدالت پسندی اور ظلم و جور اور مذہبی فریب و استھان کے خلاف انقلابی جہاد کے مظہر ہیں اور حریت اور دلاوری، جامبازی، لکر اور جذبہ کے الہام بخش اور حقیقی سرچشمہ ہیں تو ہمارا روشن فکر کروں سے مشاہہ شخص سر کو جھٹک کر کہتا ہے۔ ”جی ہاں یہ مذہبی اور پرانی باتیں کر رہا ہے“ (والشیر کی مانند مثلاً اس نے فلاں راہب کے سامنے جو حضرت عیین کے گدھے کی لید کی پاکیری گی بیان کر رہا تھا کہا تھا۔

جس وقت وہ خود کمان دار آرش کے متعلق بات کرتا ہے کہ یہاں کی سر زمین و سینج کرنے کے لئے سرحد کی حدود کے تعین کے وقت تیز چھینکتے وقت اتنا زور لگایا کہ ٹائپ ہو گیا اور وہ رسمت دستان اور سمیرغ اور تہمنیہ اور اشک بوس اور کیکاوس اور سفید دیو اور رسمت کے ہفت خوان کے بارے میں بات کرتا ہے تو اس نے اس وقت ترقی پسندی کا کام کیا۔ رزم کی روح پیدا کر دی، قومی، امتی اور ملی

بیداری اور شعور کو وجود میں لایا۔

میں مذہب کی فلسفیانہ حقانیت کے متعلق گلخگو نہیں کرتا۔ اسی معاشرتی نقطے نظر سے آیا آج کے عوام انسان ابوذرؓ کے ہجاد پر ایمان لاتے ہیں اور علیؑ کی جوان مردی اور عدل پسندی سے ہوش میں آتے ہیں اور آگہی حاصل کر لیتے ہیں یا زال اور زریر سے؟ کیا زینب (س) انہیں آزادی و ہمت و ستم کے خلاف ہجاد کا درس دے سکتی ہیں یا گرفتار ہیں؟

میں قدیم داستانوں کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا لیکن میں کہتا ہوں جب آپ روشن خیال لوگ خود قومی بیداری اور معاشرتی خود آگہی و ثقافتی احیا کے سلسلہ میں قدیم داستانوں اور دور افتادہ و مورہوم اور غالباً فراموش شدہ انسانوں کے قاتل ہیں، تو آپ لوگ کس طرح ان نزدیک کی روشن اور واضح تاریخی حقیقتوں کی اہمیت سے انکار کرتے ہیں جن پر عوام کا اعتقاد ہے جو ان کی ذات کے لئے شحل انگریز اور ان کی روح کے لئے ہیجان انگریز ہیں اور آپ لوگ کو شوش کرتے ہیں ان کو دور پھینک دیا جائے؟

یہ ثقافت ذات اور اور ذمہ داری ختم کرنے والی نہیں، بلکہ قوت بخش اور تعمیری ہے۔ بڑی سادہ لوچی اور جہالت کی بات ہو گی اگر ہم اس مذہب کے کروار کو، جس پر یہ اتهام ہے کہ تلوار کا مذہب ہے معاشرتی اور استھنار کے خلاف ہجاد، اس مذہب کے کروار سے ایک جیسا بھیں جس کی بنیاد صلح کل، نہد اور گوشہ نشینی پر ہے اور "صلیب" کا مذہب ہے۔ ہم اس کے حق اور باطل ہونے کو فلسفیانہ نقطہ نظر سے زیر بحث نہیں لاتے، مگر اگر ہم معاشرے کی قسمت پر اعتقاد رکھتے ہیں تو اس

مماشرے کے بیدار ہونے کی واحد راہ اور وہ تھا راہ جو اس مذہبی امت کے نیم جان جسد میں روح حیات و حرکت پھونک سکے اور وہ اکیلی راہ جو اس عامل کو جس نے لوگوں کو اسلام اور دین کے نام پر پھر کی طرح جامد کر دیا ہے ایک متحرک اور ارتقاء پیغمبر عالیٰ میں تبدیل کر سکے یہ ہے کہ ہم اسی راستے سے وارد ہوں جس سے استعمار وارد ہوا، اس روشن پر عمل کریں جس کا تجربہ استبداد اور رجحت پرستی نے کیا اور دونوں کامیاب ہوئے۔

اہنوں نے کیا کیا، حضرت علیؑ کی تعبیر کے مطابق ان لوگوں نے دین کی کھال کو الٹ کر اپنے جسم پر ہٹن لیا۔ اسلام کے دشمن کے خلاف جہاد کو بدھ مت اور عیسیائی طریقہ کے مطابق نفس کے خلاف جہاد سے بدل کر رکھ دیا، یہاں تک کہ امام حسینؑ کے ابلتہ، گرم اور انقلابی خون کو افیون کا نشہ آور مادہ بننا کر رکھ دیا۔

اگر روشن خیال مفکرین نجکے ہیں کہ استعمار، استبداد اور قدامت پرستی نے مذہب کو لوگوں کے خلاف اپنا اسلجہ بنایا ہے تو آپ لوگوں کے فائدے میں اس سے یہ اسلجہ لے کر اسے غیر مسلک کرویں۔

دشمن کو کس طرح سے غیر مسلک کرتے ہیں۔ اسلجہ کو ترک کر دینے، اور قدر، موجودت اور لوگوں کا اسلجہ کے فائدے کے بارے میں عدم اعتقاد سے یاد دشمن کے ہاتھ سے اسلجہ لے لینے اور دوست کے ہاتھ میں دے دینے سے؟

اسلامی معاشرے میں مذہب کے خلاف روشن خیالوں کے جہاد نے جرم، رجحت پرستی اور فریب کا دشمنوں کی سب سے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس لئے ان کی مخالفت سے مذہبی عوام الناس تو دین سے ہاتھ اٹھا نہیں لیتے لیکن وہ افراد جو

خود کو دین کا محافظ اور اپنی کیفیت کو دین کے ساتھ متنطبق کرتے ہوئے دکھاتے ہیں، ان کے پاؤں مصنفو ط ہو جاتے ہیں اور روشن خیالی اور انصاف پسندی اور آزادی کی تحریک پر جملے میں ان کے ہاتھ مصنفو ط ہو جاتے ہیں۔

ہمارے محاشرے کے روشن خیال شخص کو ان دو اصولوں کو جانتا چاہیے کہ اول یہ ہے کہ ہمارا محاشرہ اسلامی ہے اور دوسری بات اسلام ایک معاشرتی اور متحرک رزم ہے، اگر منکر اپنی تحریک کو عام لوگوں کی معاشرتی اور ثقافتی بیداری اور ترقی کے لئے اس بنیاد پر استوار کر سکے تو اس کی کامیابی یقینی اور فوری ہے۔

سید جمال الدین کو دیکھئے وہ ایک گنام غریب سید ہیں جو اسلام آباد ہمدان سے آتے ہیں بغیر اس کے کہ کسی بھی طبقے، کھرانے پارٹی یا گروہ سے وابستہ ہوں، وہ ایک آوارہ وطن ہیں جنہیں فٹ بال کی طرح اس ملک سے اس ملک میں پھینکا جاتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے زمانے میں جب مغربی استعمار پری عالمی سلطنت کے عروج پر تھا اور مشرق خواب خرگوش میں تھا۔ وہ بھی ان اسلامی محاشروں میں جہاں ہر ملک میں شاہ اور ان کے حواری اور ناصر الدین شاہ کی طرح کے کٹھ پتھلی حکومت کر رہے تھے۔ اس کے ہنگامے سے ایک بیچ اور نرہ گونجا، صور اسرا فیل کی مانند اور مسلمان اقوام لپٹنے کفن پھاڑاتے ہوئے، سکوت اور رکود کے قبرستان سے نکل کر شور اور ہنگامہ بپا کر دیتے ہیں۔ یہ تمام طاقت اور اثر و نفوذ کیوں؟ کونسا عامل اس بات کا سبب بنا کہ اس تن ہنگامے کی آواز دلوں کی گہرائیوں اور سر زیبوں کی آخری حد تک راہ طے کرے؟ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی بات تھی کہ مسلمان اقوام نے اس دعوت کی آواز کو ایک لپٹنے جانے ہوچانے شخص کی دعوت کے طور پر محسوس کیا؟

“

اہنوں نے یہ محسوس کیا یہ آوازان کے قابل فخر رہیات و رزم ثقافت و تاریخ کی روح کی گہرائیوں سے نکلی ہے ۔

یہ ایجنبی آواز نہیں ہے ۔ بیرونی فکر کی آخری موج کا ترجمہ نہیں ہے ۔ یہ آواز اسی آواز کی بازگشتیوں میں سے ہے جو غار حرا، مکہ، مدینہ، احمد، قادسیہ، المقدس اور جبل الطارق (جبل الر) اور صلیبی جنگوں میں گونجتی رہی ۔ جہاد و عزیت و طاقت حیات بخش دعوت کی آواز ہے جس کی بازگشت اسلام کی پر رزم تاریخ کے کانوں میں گونجتی رہی ۔ یہ نہاد ہے جو مسلمانوں کے افکار و احساسات کے تاریخ پر و سے آشنا رکھتی ہے ۔ یہ اطمینان بخش اور خیال انگیز ہے ۔ اس بنا پر ہر شخص اسے روح کی گہرائی سے سنتا ہے ۔ یہ روشن خیالی زبان ہے جو اپنی ثقافت و تاریخ و ملت کی زبان سے واقف ہے ۔ یہ ایک ایسی واقفیت ہے جو زمانے اور تقدیروں پر حکمران طاقتوں کے باوجود روشن خیال مفکر کو کامیابی کی قوانین اور امکان بخشتی ہے ۔ اسلامی معاشرے میں یہ عظیم مذہبی قوت سادہ طریقہ سے ایک تعمیری و آگہی بخش طاقت میں تبدیل ہو سکتی ہے ۔

اگر ہمارا روشن خیال مفکر جانے اور بہچانے تو سمجھ لیتا ہے کہ اسلامی ثقافت ایک باطنی رہبانی، انفرادی اور زندگی معاشرہ کی مادیت سے جدا ثقافت نہیں ہے ۔ یہ جہاد کی ثقافت ہے ۔ سیاسی ثقافت ہے ۔ معاشرتی ثقافت ہے ۔ اس کی بنیاد اجتماعی ذمہ داری اور عزیت، اقتدار حکومت اور رہنمائی پر استوار ہے ۔ یہ دنیا کی طرف رمحان کی ثقافت ہے ۔

آخرت تمام مذاہب کا نصب العین ہے لیکن اسلام میں آخرت اس دنیا کی

زندگی کا ہی انعکاس ہے۔ دنیا سب بجھے آخرت پر مقدم ہے۔ آخرت کچھ نہیں ماسوائے دنیا کے منطقی اور علت و معلوی انجام کے۔

اقتصاد اصل ہے "آخرت اس معاشرے کی ہے۔ جس کے پاس معاش ہے۔"

(پیغمبر) جس کے پاس روٹی نہیں ہے اور بھوکا ہے اسے ننگی تلوار سے سب کے خلاف

شورش کرنا چاہیے اس لئے کہ سب اس کی بھوک کے ذمہ دار ہیں۔" (ابو ذر)

اسلام اشرافیت کا مخالف ہے اور عام لوگوں کا دین ہے۔ حکمران طبقات سے

صلح ناپذیر جہاد کرتا ہے۔ ملا (موٹے دماغ والوں)، مترف (موٹے پیشوں والے) اور

ہیاں تک کہ مذہبی طبقہ (امبار و رہبان) سے جو تمام معاشروں اور گذشتہ ادیان میں

حکمران طبقات میں سے رہے ہیں! اسلام کا آخری نصب الحین عدل اور دنیاوی

مساویات و برابری قائم کرنا ہے۔ "لیقوم الناس بالقسط" (صورہ حدید آیہ ۲۵) (تاکہ

لوگوں میں عدل قائم کرے)

تاریخ اسلام کا فلسفہ دنیا کے اسیر ضعیف اور حکوم لوگوں کی قطعی اور مقدر

فتح اور ان کی روئے زمین پر حکومت ہے۔

"و نزیدان نحن علی الذین استضعفوا فی الارض و نجحظم آئمہ و نجحظم الوارثین

(القصص۔ آیہ ۵) (اور ہم چاہتے ہیں کہ احسان کریں ان لوگوں پر بھوک کر کر دیا

گیا ہے زمین میں اور ان کو پیشوں بنا دیں اور زمان کو مالک بنا دیں)۔

اس دین میں جس کے رائمناؤں اور شخصیات نے جنگ کے میدانوں یا

زندان کے گوشوں میں جان دی ہے اور اس دین میں جس کے رہبران بہت خانوں

اور پہاڑوں کے غاروں میں گل سڑکتے، فرق ہے۔ افسوس کہ ان باتوں کو نہ تو

ہمارے اکثر دشمن خیال افراد ہی سمجھتے ہیں اور شہ ہی مذہبی افراد کی اکثریت ایں یہ دونوں اسلام کے متعلق ایک ہی قسم کی سمجھ رکھتے ہیں ۔ پیغمبر فرماتے ہیں ۔ "من لا محاش له لا معادله" (جس کی کوئی مادی زندگی نہیں، اس کی کوئی آخرت کی زندگی بھی نہیں ہیں) ۔ وہ فرماتے ہیں "کا دل القرآن یکون کفرا"۔ (فقود عربت کفر کا ہم دیوار ہمسایہ ہے)

ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں "جب فقر ایک دروازے سے وارد ہوتا ہے تو دین دوسرے دروازے سے باہر چلا جاتا ہے" یہ دین صوفیانہ دین سے مخاہر ہے جو کہ یہ کہتا ہے کہ "لپٹے اندر وون (پیٹ) کو کھانے سے خالی رکھ" ۔

علامہ اقبالؒ کے کام کی عظمت ان مسائل اور اس اسلامی معاشرتی سیاسی و ثقافتی بصیرت کی بنیاد پر ظاہر ہوتی ہے ۔ انہوں نے مغرب کو نزدیک سے ہبھانا اور مغرب کی ثقافت، معاشرہ اور تاریخ سے گہری، براہ راست اور ہمہ جانبہ واقعیت کے ذریعے انہوں نے مغرب زدگی کی تیزی سے نجات پائی ۔

مغرب زدگی سے جہاد کی ایک راہ مغرب کی حقیقی ہبھان حاصل کر لینا ہے ۔ یہ لوگ جو فرنگی ہنابنے پھرتے ہیں اور یورپی تمدن کے شیفتہ اور شیدائی ہیں ۔ اس کو عالمانہ، درست طریقے اور نزدیک سے نہیں ہبھانتے، اسی طرح جیسے کہ متعصب اور فرامست پرست رجعت پسند افراد جو مغرب اور مغرب کے تمدن و ثقافت کے متدہ طور پر اور بقول فرنگیوں کے ممنظم انداز میں مخالف ہیں ۔

علامہ اقبالؒ نے مغرب میں خود کو آج کی دنیا کے عقلی تفکر کی بلند ترین

چوٹی پر چھایا۔ انہوں نے یورپ کی جدید سائنس و تکنالوجی کی اہمیت سمجھ لی۔ اقبال ایران اور ایرانی ثقافت سے واقف ہوئے اور ایرانی اسلامی ثقافت میں جو معنویت و لطافت، روح و باریکی اور بصیرت کی گہرائی ہے۔ خصوصاً جو اس کے ادبی جلوہ میں ہے اس کو اخذ کیا۔

اس سے آگے بڑھ کر دیکھیں تو اقبال کے تفکر کی نظرت قومی تفکر ہے۔ جو ساری تاریخ کے دوران احساس کی باریکی، تخلیل کی نزاکت روح کی صفائی اور دل کی معنویت اور اشراق والہام ان کی نسلی اور ثقافتی خصوصیات میں شامل ہیں۔ اقبال نے ہندوستان میں، لپتے اس عظیم معنوی سرمائے اور ان شروتوں اور ایسی روح اور بصیرت کے ساتھ اسلام پر آنکھ کھول کر نظر ڈالی اور اس چیز کی توانائی اور لیاقت حاصل کر لی کہ مکتب اسلام کے نکڑے نکڑے اور پر آنکھہ عناصر کو مجع کر کے اس کی دوبارہ تعمیر کریں۔

علامہ اقبال مسلمان کی ایک ایسی روح ہیں جس کے متعدد ہیلو ہیں۔ انہوں نے نہ صرف یہ کوشش کی کہ اسلامی نظریہ کے نکڑے نکڑے ہو گئے ہوئے پہلوؤں کو اور بکھرے ہوئے اعضاء کو زندہ اسلامی پیکر کی صورت میں جو تمام تاریخ کے دوران سیاسی فرمیوں اور فلسفیات و معاشرتی ضد و تناقض رجحانات کے ذریعے سے نکڑے نکڑے ہو گیا ہے اور اس کے ہر نکڑے کی لگہداشت کسی ایک نکڑے کے اندر ہو رہی ہے، مجع کریں ان کی شیرازہ بندی کریں۔ دوبارہ اس کی عمارت کی تعمیر کریں ان کا شاہکار نہ صرف ان کی کتاب "ذہبی فکر کی تعمیر جدید" ہے بلکہ اس سے بھی بڑا شاہکار ان کی اپنی نادر، چند ہیلو اور کامل شخصیت کا بنانا اور اپنی ذات میں

ایک "کامل مسلمان" کی عمارت کی دوبارہ تعمیر ہے!

وہ ایک "خود ساختہ" عظیم اور گرائیا ہا شخصیت ہیں۔ وہ کس طرح اپنے آپ کو اسلام کے دنے ہوئے مسلمان کے بارے میں نقشہ کے مطابق تحریر کر سکے؟ ایک انقلابی کے نئے جنم کی صورت میں ایک عام روایتی ہندوستانی مسلمان زادہ، ایک فرنگی تاب انگلستان کا تعلیم یافتہ جوان، لندن سے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لیتے والا ہندوستان کا ایک فارسی گو شاعر، ایک نوآبادی (کالونی) ملک میں ایک روش خیال استعمار کا مخالف جوان بیسویں صدی میں، ایک "کامل مسلمان"، ایک علی صفت مسلمان، میں تبدیل ہو گیا۔

علی صفت کے کیا معنی ہیں؟ یعنی ایک ایسا انسان جو، ان تمام انسانی ہمہلوؤں کے ساتھ جو عام طور پر ایک فرد میں جمع نہیں ہوتے۔ یہ بات بہت غیر عینی و دقیق ہو گی اگر ہم علامہ اقبال کو استعمار کا مخالف ایک آزادی پسند اور ترقی پسند مسلمان را ہم کے عنوان سے یاد کریں۔

علامہ اقبال ترقی یافتہ عقلی و فلسفی بصیرت اور ایک الیے سرمائے کے ہمراہ جو انہوں نے مغرب کے جدید فلسفے اور آج کے یورپ کے پیش رفتہ تعلق سے حاصل کیا تھا اور اس اشراق والہامی روح کے ساتھ جو ایک ہندی مفکر ہونے کے نابطے ان کی قومی اور ذاتی فطرت میں موجود تھی اور ایسی پرورش و تربیت اور استزراق کے ساتھ جو انہوں نے گھرے شہوت مند اور بلند اور حرکت و حرارت اور اسلامی انقلاب سے بھرے ہوئے عرفان سے حاصل کیا تھا اور اس عقیدت و عشق و معرفت کے ہمراہ جو انہیں مولانا روم ان کی شنوی، دیوان شمس اور فکر اور ثقافت

بھرے عربی ادب سے تھی اور آغز کار اسلامی فلسفوں، تاریخ، اسلامی علوم میں فکری تغیرات کے بارے میں وہ وسیع اور جام شاخت جو انہوں نے حاصل کی تھی اور خاص طور پر مشق اور تجربہ کے ساتھ وہ عمیق، گہری اور تمام جانبہ واقفیت جو انہیں جوانی سی سے براہ راست قرآن کے بارے میں حاصل ہوئی تھی اور وہ اس کی روح، جذبے اور زبان سے مانوس ہو چکے تھے، انہوں نے ایک عمیق جہان بینی پالی تھی۔ اور وہ ”فلسفہ خودی“ کے نام سے ایک استوار و مکرم فلسفیانہ نادور بنیاد تک جو اسلامی ثقافت اور بصیرت پر بینی تھی، ہنچ گئے تھے جو بیک وقت کائنات، انسان اور زندگی کی ان کے لئے تفسیر کرتا ہے۔

اس مقام پر علامہ اقبال ہمارے لئے ایک مسلمان مفکر کی حیثیت سے ظاہر ہوتے ہیں جو دنیا اور آج کی دنیا کے تفکر اور اس دور کے تفکر کی بندگیوں سے واقف ہیں اور ہمیں جو اسی حالت میں تیسیری دنیا یعنی پیمانہ دیا ترقی پذیر اور متحرک معاشروں سے والبستہ روشن خیالوں کے طور پر مادی کیابی اور معاشرتی اور اقتصادی پریشانیوں کی وجہ سے رنج اٹھاتے ہیں۔ ہم عالمی ثقافت و فکر سے متاثر روشن خیالوں کی حیثیت سے جو فکری پریشانی، فلسفیانہ مایوسی، اعتقادی بنیادوں کے تزلزل اور تمام اخلاقی اور معنوی معیاروں کی عمارت کے ڈھ جانے اور آج کے انسانیت کے فلسفیانہ اور علمی فکر کی بندگی سے شدید طور پر متاثر ہیں علامہ اقبال ہمیں لپنے مذہبی اور اسلامی ایمان کی بنیاد پر مطمئن کر سکتے ہیں۔

دنیا اور انسان کے بارے میں ایک مسلمان مفکر کی حیثیت سے ان کی جہاں شاہی اور فلسفیانہ روشن ہمارے لئے، جو کہ اسلامی فلسفے کو ان کے دو عرفانی اور

قدیم صوفیاں پھر ہوں کے ساتھ ہچکتے ہیں اور یا ان کو بولی سینا، ابن رشد، غزالی اور ملا صدر اکے قدیم فکری سانچوں میں اور یا ان کے بلاکوں کے چوکھوں اور عام اور موروثی روایت سے ہچکتے ہیں، بہت زیادہ قابل قدر ہے اور اس سے واقفیت بڑی فوری اور حیاتی اہمیت رکھتی ہے۔

اس سے بڑھ کر، علامہ اقبال ایک اسلام شناس ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے اسلام کو ایک مذہب کے طور پر، بغیر اس کے کہ اس کو ہچانے کی ضرورت محسوس کریں، ایک طرف رکھ دیا ہے اور بے سوچ سمجھے اس کو مہم کر کے اس کو مسترد کر دیا ہے اور اس طرف سے بے فکر ہیں اور بہت غور کے ساتھ اور فخر کرتے ہیں کہ روشن خیال ہو گئے ہیں، نیز وہ افراد جو اسلام کو اس کے محدود رائج روایتی سانچوں میں جلتے ہیں اور اسی پر قناعت کئے بیٹھے ہیں اور وہی چیزوں کو سیر کرتی ہے، انہیں اسلام شاسی کی ضرورت نہیں ہے۔

ان روشن خیالوں اور ان موسنوں دونوں کے لئے اسلام عبارت ہے اس سے جو ان تک سینہ بہ سینہ اور روایتی طور پر ہچکا ہے اور ان دونوں کے درمیان صرف یہی فرق ہے کہ ایک اس کا معتقد ہے اور دوسرا اس کا منکر!

مگر ان لوگوں کے لئے جو اس بات کے پابند ہیں کہ جب تک کسی مکتب کو درست اور باریکی بینی سے ہچان نہ لیں اس کے متعلق فیصلہ نہ کریں، ان کے لئے جو خود سوچتے اور تنقیح کرتے ہیں اور اپنے عقاید کو لباس کی وضع قطع اور فیشن اور رواج اور یورپی پسند کے مطابق آرائش ورقص و اسباب خانہ اور گاڑی کی مانند انتخاب نہیں کرتے اور ان لوگوں کے لئے جو جدت پسند اور روشن خیال ہونے کے خبط

میں بیٹلا نہیں اور ان کے لئے جو شہزاد کرتے ہیں کہ خرافاتی اور موروثی مذہبی ہوں اور نہ یہ کہ مذہبی اطوار رکھنے والوں کے مخالف اور ترجمانی اور تقلیدی مذہب والے ہوں اور آخر میں اصلی اور حقیقی روشن خیالوں کے لئے جو یہ جانتے ہیں کہ اپنے معاشرے کو اپنی ثقافت اور لوگوں کو ہبھانے کے لئے اپنی قوم کے دل کی گہرائی تک راہ پانادنیا کی مسندن اقوام کے عظیم حصے کی تاریخ کو جانتا اور انسانی تاریخ میں دنیا کی عظیم ترین تقدیر و ثقافت کے سمجھنے کے لئے اور بالآخر اس عظیم تحریک کے سبب یا اسباب کو سمجھنے کے لئے جو دنیا میں ظاہر ہوئی نیز انسانی زندگی کے عظیم ترین مذہبی، فکری، اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی مکاتب میں سے ایک سے واقفیت کے لئے اسلام کو ہبھانتا چل ہے، ان کے لئے سائنسی، علمی اور باریک بینی کے راستے اور علامہ محمد اقبال جیسے عظیم مفکر اور جدید فکر والی پرماںیہ شخصیت کے ذریعے "اسلام شناسی" ایک چند جانبہ معنوی، معاشرتی، سائنسی، تاریخی اور سیاسی ضرورت ہے۔

یہ ایک خود شناسی ہے کیونکہ ہم جو بھی فلسفہ رکھتے ہوں بہر حال ہم نے اس مکتب اور اس تاریخ میں جنم لیا اور پرورش پائی ہے۔

علامہ اقبال ایک مصلح اور انقلابی اسلامی مفکر ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں علامہ اقبال جیسے اسلام شناس مصلح اور مفکر کے کام کی قدر و مزلاست اور ان کے کردار کی عظمت واضح ہو جاتی ہے۔ وہ اسلامی عالم بھی ہیں اور معاشرتی آگہی رکنے والے بھی ایک ترقی پسند ذمہ دار روح بھی رکھتے ہیں اور استعمار کے مخالف بھی ہیں۔ اسلامی معاشرے کے روشن خیال افراد جان لیں گے کہ وہ اپنے معاشرتی فرض کی ادائیگی میں کس حد تک اقبال جیسے شخص کی فکر کے ضرورت مند ہیں اور ان کو خود ہبھانتا اور ان

کی فکر کو پہنچانا کس حد تک مسلمان عوام کی بیداری حرکت، ثقافتی انقلاب اور معاشرتی خود آگئی میں موثر اور کس حد تک اسلامی روشن خیال دانشوروں کے لئے نہوش ہو سکتی ہے۔

علامہ اقبال ایک استعمار کے مخالف رہا ہے۔ بعض تاریخی اور معاشری حالات میں ایک خاص موقف اختیار کرنا ایک شخصیت کے قیام پہلوؤں یا کسی مکتب یا کسی فکر نو ع اور اصلاحیت کی پہنچان کرنے والا ہو سکتا ہے کسی پہمانہ یا استعمار زدہ معاشرہ میں استعمار کا مخالف ہونا ہی سیاسی روحانی کا واحد نشان ہی کرنے والا نہیں ہوتا بلکہ انسانی شخصیت اس کے انسانی علم و شعور اخلاقی صداقت، روحانی تقوی کے درجہ اور کسی فرد کے مذہب یا مکتب کا نشان دہندا ہوتا ہے۔

آج کا ایک یورپی کہہ سکتا ہے کہ میں فلسفی، ایک ادیب اور ایک فنکار یا ایک انجینئر یا ماہر اتصادیات ہوں مگر سیاسی شخص نہیں ہوں، سیاسی مسائل پر غور نہیں کرتا اور سیاست کو میں نے سیاستدان کے لئے چھوڑ رکھا ہے۔

مگر ایک افریقی، ایک ایشیائی یا امریکی استعمار زدہ ہر گز ایسا اعتراف نہیں کر سکتا اس لئے کہ ایک ترقی یافتہ اور نسبتاً زیادہ صحت مند یا کم از کم فطری معاشرے میں سیاست، معاشرتی اور فکری سرگرمیوں میں سے ایک اختصاصی شعبہ ہے اور کوئی ضرورت نہیں کہ ہر شخص خود کو اس کا پابند محسوس کرے۔

ایک یورپی شخص ادیب یا فلسفی یا ماہر اتصادیات ہو سکتا ہے اور یہ کہ سیاست کے کام کو سیاسی لوگوں یعنی ان افراد کے سپرد کر دے جہنوں نے خود اور ان کے معاشرے نے اس کام کی ذمہ داری کے لئے منتخب کیا ہے، لیکن ایک پہمانہ

استعمار زدہ ملک میں سیاست ایک ایسی "واجب کفایٰ" نہیں ہے کہ اس "فن" کے تخصص رکھنے والے اس میں مشغول رہیں۔

اسلام اعلان کرتا ہے کہ تاریخ میں ادیان حق کا نصب العین انصاف اور عدل کا قیام اور زمام حکومت کو روئے زمین کے (غربت میں) اسیں اور کمزور لوگوں کے حوالے کرتا رہا ہے۔ یہ نکتہ ہلا سکھانے والا اور غور و فکر دلانے والا ہے کہ اصحاب پیغمبر اسلام (ص) میں سے ہم حتیٰ ایک کو بھی نہیں جانتے جو مسلح مجاہد اور حقیقی ولی بخش ہو۔ ہر مسلمان خود مخدود زندگی میں نہ کہ استثنائی حالات و حوادث میں ایک مسلح طرف دار (اسلام) ہوتا ہے۔

اسلام واحد ذہب ہے جو صرف وعظ و نصیحت نہیں کرتا بلکہ خود کلمہ کی حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے تلوار بھی کھینچتا ہے۔ اگر چاہیں کہ پیغمبر اسلام (ص) کے لئے ایک جسمہ بنائیں تو یہ چلہیے ہو گا کہ ان کے ایک ہاتھ میں کتاب اور دوسرے میں شمشیر ہو۔ حقیقی مسلمان ہرگز بلا سبب صلیب پر نہیں چڑھایا جا سکتا۔ خلام احمد قادریانی، جس نے کوشش کی ہندوستان میں ایک نئی اسلامی تحریک بپاکرے، اسے ہندوستان پر انگریزی استعمار کے تسلط سے کوئی سروکار نہ تھا اور یہاں تک کہ ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کے تعصب کو روکنے کے لئے ان کی موجودگی کو مفید سمجھتا تھا اور اس نے اسلام سے جہاد کو بھی اٹھایا، وہ مسلمانوں کی نگاہ میں نہ صرف یہ کہ کوئی رہبر اور اسلامی مسلح نہیں سمجھا گیا، بلکہ اس کو ایک مشکوک بدعت گزار، مخفف گراہ اور غدار کہا گیا۔

علامہ اقبال صرف اس سبب سے کہ ایک آگاہ مسلمان اور اسلامی مسلح تھے

ایک استعمار کی مخالف شخصیت بھی تھے۔ ہندوستان کی آزادی اور ایک پاکیزہ اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھنے کی ان کی کوشش، جو انگریز کی غلامی، رجعت پرستی، انحطاط اور خرافات سے آزاد ہو، سب پر عیاں ہے، اس طرح سے کہ بہت سے لوگ انہیں فقط ایک سیاسی شخصیت اور استعمار کا مخالف آزادی کا طلب گار اور تحریک آزادی ہند میں ایک بہادر، سیروکے طور پر جانتے ہیں۔ وہ استعمار کو اس کے ساری شکلوں میں ہدفِ حملہ قرار دیتے تھے۔

علامہ اقبال ایک شاعر ہیں شاید یہ صفت اقبال جیسی سمجھیں اور عظیم شخصیت کے لئے ہلکی ہو لیکن ہر فن کا وزن اور قدر و قیمت فنکار کے وزن اور قدر و قیمت سے والبستہ ہوتی ہے۔

جلال الدین محمد بخشی، وہ حریر اور عظمت کی روح جس نے ہمارے آسمانوں کو پر کر دیا ہے اور ہماری تاریخ آج بھی اس کے پیدا کئے ہوئے شوروں کی جان سے لرزہ ہی ہے، ایک شاعر ہی تھے۔

شاعر ہونے کے کیا معنی ہیں؟!

اس کے معنی ہیں ایک طرح سے بات کرنے کا فن رکھنا، ہذاہر شاعر کی قدر و منزلت اس سے ہے کہ وہ کس شے کے بارے میں لگٹکو کرتا ہے اور اس فن سے وہ بات کے کہنے کے لئے جس کو لوگوں تک پہچانے اور ان پر اثر ڈالنے سے نظر عاجز ہے کیسے کام لیتا ہے؟ علامہ اقبال ایک ذمہ دار و آگاہ فنکار کا نمونہ ہیں۔ آج فن اور اس کے معاشرتی ذمہ داری اور فنکار کی اس زمین و زمان سے جری آشنائی اور رابطہ کے بارے میں جس میں وہ زندگی گوارتا ہے اور فنی تخلیق انعام دیتا ہے بہت زیادہ

### گفتگو ہوتی ہے ۔

”عہد کرنے والا ادب“ کے معنی ہیں وہ ادب جس نے خود کو جبرا لوگوں کی خدمت میں قرار دیا ہے تاکہ استھان کرنے والوں اور سرمایہ داری اور بورڈوائی تسلط کے خلاف محاذپر ان کی مدد کرے ۔ لہذا عہد کرنے والا ادب یورپ میں قطعی طور پر طبقات اور سرمایہ داری کا مخالف ہے اور اس مزدور طبقہ کے ہمراہ اور قدم ہے قدم چلتا ہے جو اپنی آزادی اور کامیابی کے لئے لڑ رہا ہے ۔ مگر تیسری دنیا اور خصوصاً استعمار کی شکار دنیا میں یہ ادب ہر چیز سے پہلے استعمار کا مخالف ہے ۔

علامہ اقبال لپتے زمانے اور معاشرے کے ایک اہل فن اور ایک ذمہ دار اور عہد کرنے والے شاعر ہیں مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ انہوں نے لپٹنے اور جذبہ سطح اور فنکارانہ اور ادبی خلاقیت کے دامن کو پہنچ سطحی سیاسی اخباری نعروں اور سنتے بیانات کی حد تک گرا دیا ہے ۔ ان کے کام میں فنکارانہ عہد کا مسئلہ روزمرہ سیاسی مسائل تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک وسیع اور عمیق فکری اور انسانی ذمہ داری رکھتے ہیں جس کا ایک لازمی اور قطعی مسئلہ استعمار کا مخالف ہوتا ہے ۔

علامہ اقبال نے افریقی ایشیائی معاشروں میں موجود متحصب اور ایک ہمپتو والے افراط اور تفریط کے دو گروہوں کے درمیان ، جنہوں نے مغرب کے خلاف موقف اختیار کیا ہے ، ایک تیسرے گروہ کا اعلان کیا ہے ۔

ان دو گروہوں میں سے ایک تو اس بات کا معتقد ہے کہ ہم ”سر سے پاؤں کے ناخن تک فرگنی“ ہو جائیں اور مغرب کے مقابلے میں کسی انتخاب کو اختیار نہیں کیا جاسکتا ہے ۔ یورپ کا تمدن ، اس کی ثقافت ، اخلاق ، فلسفہ ، فکر ، فن اور اس کی

زندگی کا جدید قریئہ واحد ہم جنس، ناقابل تقسیک و تقسیم بناوٹ ہے، اس کو سمجھا اکھنا اور مکمل طور پر قبول کیا جانا چاہیے اور ہم لوگوں میں اس سے مغایر و مختلف جو کچھ بھی ہے اسے سمجھا اور مکمل طور پر دور پھینک دینا چاہیے۔

ایک گروہ اس طرف پڑا ہوا ہے اور مغرب سے ہر قسم کے اقتباس و تحصیل کے ساتھ دشمنی رکھتا ہے، سہاں تک کہ موڑ کار پر سوار ہونے یا جدید تعلیم حاصل کرنے والے ڈاکٹر سے رجوع کرنے کو بھی خلاف شرع جانتا ہے۔ مغرب کو اس طرح سے سمجھا اور مکمل طور پر اس کے تمام مظاہر اور ثقافت کے ہمراہ مسترد کر دینے کا خیال حتیٰ چین کی پارٹیوں، ہند اور جاپان کی بعض پارٹیوں اور خصوصاً ہندوی دینی پیشواؤں کے درمیان موجود رہا ہے اور آج بھی ہے۔ مگر علامہ اقبال مشرقی اور مغربی بصیرت، طرز زندگی، تمدن اور ثقافت کی تقدیر اور ان کے افکار کی کیفیت کے تجربے اور تقدیم سے ابتدا کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

شرق حق را بیدار عالم را ندید      غرب عالم را بیدار از حق رسمید  
(مشرق نے حق کو دیکھا اور عالم کو نہ دیکھا اور مغرب نے جہان کو دیکھا اور حق سے بھاگا)۔

اس کے بعد اعلان کرتے ہیں کہ مغربی فرنگی تمدن کے سامنے مکمل طور پر سر تسلیم خم کرنا مشرق کی ڈلت اور علامی بھی ہے اور جو کچھ کہ مشرقی ہے اسے ہاتھ سے کھو دیتا بھی ہے جس کی انسانیت محتاج ہے یعنی حق پرستی، شوق ماورائی عشق، غیب کی تلاش، فضیلت کی جستجو، مطلق کامل حقیقت اور وجود کے معہ کے مقابل مشرق کی روح کی دامنی تشویش اور مغرب اور اس کے طرز تمدن سے قطعی طور پر کٹ جانا،

جمود میں رہنا اور کمزوری ہے، مہماں تک کہ یہ اس کے تسلط کے مقابلہ میں اس کی غلامی کا قبول کرنا ہے، کیونکہ ایک غیر صنعتی معاشرہ ہمیشہ مغرب کا وظیفہ خوار اور صنعتی استعمار کا خطرہ اسے ہمیشہ لاحق رہے گا۔

علامہ اقبال کہتے ہیں مشکوک مفکروں کے بر عکس جو یہ کہتے ہیں کہ مغرب کی سائنس اور صنعت کو نہیں لیا جاسکتا اس طرح کہ اس کے مدن، ثقافت اخلاق اور معاشرتی تعلقات اور طرز زندگی کو ایک طرف رکھ دیا جائے۔ نہ فقط ایسا کیا جا سکتا ہے بلکہ ہمیں ایسا کرنا چاہیے کہ کوئی ایسی دلیل موجود نہیں جو یہ ثابت کرے کہ وہ معاشرہ جو روح کی بلند وبالا عشق و عرفان اور دل کے اشراق (نور) اور پاکیرہ و عمیق، اخلاقی اور معنوی لذتوں سے ہمکنار ہو، وہ گائے اور ہل کے بجائے ٹریکٹر نہیں چلا سکتا (اونٹ کے) کجاوے کے بدالے میں جیت (ہوائی جہاز) پر سوار ہو اور موم بی کو دور پھینک کر جھلی کا بلب جلائے۔

نہ صرف ایسا کام ممکن ہے بلکہ بشریت کی ذمہ داری اور اس کا تصور ان دونوں کا جمع کرنا ہے۔ انسانیت اسی وقت کامل ہے کہ وہ شخص جو دل کی پرواز اور روح کے مراہوں سے آشا ہے، ہوائی جہاز سے پرواز کرے اور فضا میں بلند ہو اور سیاروں کی طرف سفر کرے۔ ایسا انسان زیادہ لیاقت و قابلیت رکھتا ہے اور انسان کی طرف اس کی پرواز انسانیت کے کمال اور اس کی سعادت کے لئے زیادہ فائدہ مند ہو گی۔

اقبال کا پیغام یہ ہے کہ ہم اپنی آگ کو اپنے دلوں میں روشن کریں اور ایمان و عرفان کی روح کو اور اس عظیم انسان پرور عشق کو دوبارہ اپنی جانوں میں مشتعل

کریں تاکہ روح ہستی و جان کے معنی اور فطرت کے راز اور وجود کے اہتمائی ہدف سے زیادہ آشنا ہو جائیں اور یورپ کی طرح طاقت و قوت و کامیابی و مادی و صنعتی آسائش و رفاه کے اوج پر کھوکھلے پن ، تاریک اندیشی ، ایمان کی پراؤنگدگی و فکر کی گمراہی و اخراف سے دوچار نہ ہوں اور مذہب کو اپنے اندر طاقت دیں ہمہاں تک کہ اس کی طاقت سے لپٹنے اور تسلط اور قابو حاصل کر لیں اور انسانیت کی نعمت کرنے والے رہنمایاں اور پست اور جرم آمیز خواہشات اور ہواہ موس اور طبع اور خوفون اور روح اور مزاج کے ضعف سے رہا ہو جائیں اور آزادی تک پہنچ جائیں اور دوسری طرف سے مغربی دنیا کی بیش رفتہ و ترقی یافتہ سائنس و مینکنالوجی اور زندگی کی منطق کو بھی لے لیں ، تاکہ کائنات پر تسلط حاصل کریں اور فطرت کو اپنے لئے سمح کریں اور ان دونوں کی مدد سے فتو و ضعف اور فطرت کے قاہر عوامل پر قابو پالیں اور اپنی مادی خواہشات سے بے نیازی کے ذریعے جو سائنس اور مینکنالوجی کے ذریعے ممکن ہے ، نوع انسان کے معنوی تکامل اور حقیقت طلبی اور ترقی کو زیادہ تری اور ثروت مندی سے جاری رکھیں ۔

جاپان کا تجربہ اگرچہ علامہ اقبال کی تصوری مثال کے لئے کامل مثال نہیں ہو سکتا مگر روشن خیال مفکروں کے ایک گروہ کے روشن خیال ماتندا استدلال کو تردید کے لئے یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ اپنی قومی ثقافتی ، اخلاقی شخصیت کی خفائیت کی جائے اور یورپ سے صرف صنعت اور سائنس کو حاصل کیا جائے جاپان کی مثال ایک زندہ عینی اور قریبی مثال ہے ۔

جاپانی عورت پر نگاہ کریں ۔ وہ اپنی ہی بنائی ہوئی ڈیلکس کار کے ساتھ اور آج

کی زندگی کے تمام جدید ترین وسائل کے ساتھ کھڑی ہے جبے اس نے خود بنایا ہے، مگر اسی قدیم زنانہ جاپانی قومی اخلاق اور خصالی کے ساتھ اور دیانوی دور کے انہی لباسوں اور آرائشوں کے ساتھ۔

علامہ اقبال کی یہ آرزو تھی کہ پاکستان بیویں صدی کے اسلام میں ایک نیا اور بڑا تجربہ ہو وہ ایک الیسا مشرق ہو جس نے مغرب کے تدن کو لپٹنے اندر تعمیر کیا ہے یا یورپی تدن کو وہاں مشرق کی روح کو لپٹنے طاقتور قلب اور وجود میں پھونک دیا ہے۔ الیسا محاشرہ اسلام کا پسندیدہ محاشرہ ہے جیسے کہ وہ خود بھی اسی طرح کے انسان تھے مشرق کا دل مغرب کے دماغ کے ساتھ یعنی ایک مطلع اور نو تعمیر شدہ مسلمان۔

یہ نہ صرف مسلمانوں کی ضرورت یا مشرق کی ضرورت بلکہ انسانیت کی ضرورت ہے۔ وہ بشریت جس کا نصف مغرب میں ترقی کر رہا ہے اور آؤ ہے نے مشرق میں بلوغت و ترقی حاصل کی ہے اور دونوں ناقص نئے (مل کر) کامل بشریت بنتی ہے۔ یہ ایک الیسا پرندہ ہے کہ جس کے دوپر ہیں ایک اس طرف اور ایک اس طرف، ایک دوسرے سے جدا ہوئے پڑے ہیں جب تک یہ دوپر ایک دوسرے سے جدا رہ کر پرورش پائیں گے اور قوت حاصل کریں گے اس پرندہ کو زمین سے نہیں اٹھا سکیں گے، (کہ وہ پرواز کر سکے)

اسلام ایک کوشش کا نام ہے ان دوپروں کو، ایک پرشکستہ اور زمین پر گرے جسم سے جوڑنے کا، اس بات کی کوشش کہ یہ دوپر ہم آہنگ اور ہم یہمانہ اور باہم ہیوستہ ہو کر یکجا پرورش پائیں۔ مگر افسوس کہ اسلام تو خود بھی اس پرندے ہی

کی تقدیر سے دوچار ہو گیا، اور علامہ اقبال نے کوشش کی ہے کہ اس کی تعمیر نو کریں۔

یہ وجہ ہے کہ علامہ اقبال کی کوشش اور دیگر تمام واقف اور متفکر اسلامی مصلحین کی کوشش کسی ایک مذہب یا خاص ملت کے چونکھے میں محدود نہیں ہیں۔ بسیک وقت یہ تمام انسانیت کی تعمیر نو اور نئی تمدن کی تعمیر نو اور ایک جدید انسانی و نسل کا بنانا ہے وہ شے جس کی فانون آرزو کرتا تھا۔

آخر علامہ اقبال ایک ایسے نابغہ روزگار متفکر ہیں جنہوں نے سید جمال الدین کے بعد "اپنی خودی کی طرف بازگشت کی تحریک" کو اس عظیم اسلامی امت میں جو خلیج فارس سے شمالی افریقیہ اور چین کے کناروں تک پھیلی اور پراگنہ ہے، جاری رکھا۔

خودی کی طرف واپسی کے معنی ہیں اصل انسانی خودی کی طرف بازگشت اپنی تعمیری ترقی پذیر اور خود اگاہ ثقافتی و فکری قدروں کا احیاء۔ خودی کی طرف واپسی، خود شناسی اور خود سازی (تعمیر نفس) کی ایک گہری اور دشوار تحریک ہے۔ اس کا لازمہ یورپ کے تمدن و ثقافت کی ہہچان ہے۔ آج کی دنیا کو اس کی تمام براہیوں اور خوبیوں سیست، ہہچانا، تیر تمدن، ثقافت، ادب، مذہب، انسان کی اصلیتوں اور ہمارے تمدن اور معاشرے کے انحطاط اور ارتقا کے عوامل اور عوام سے تفاہم اور معاشرے کے تمن سے، ہم آہنگی اور آخر میں ان چیزوں کا احیاء جسے انحطاط نے ہمارے درمیان مار دیا اور استعمار ہم سے چھین لے گیا اور ہمارے اندر مشوخ اور منتقلہ کر گیا اور یہ ایسا کام نہیں جو امہ سیر اور فانون کے

ایک دو بال مشافہ گفتگو کو چند ایرانی مصنفین ترجمہ کریں یا چند مقالے لکھیں جس میں روایت کی طرف واپسی کے متعلق ان کی تقلید میں بحث کریں۔

اپنی خودی کی طرف واپسی کس طرح سے جیسے علامہ اقبال نے واپسی اختیار کی وہ یورپ گئے اور آج کی عالمی سطح کے فلسفی مفکر بن گئے انہوں نے مغرب کی ثقافت و تمدن اور معاشرے کو مختفانہ طور پر ہبھانا اور اس کے بعد اسلام کی طرف واپس آگئے اور خود کو محنت و کوشش و تفکر و تعلیم و دامی جہاد، اسلام کے مطالعہ، قرآن، عرفان اور ثقافت کی ہبھان، عوام، مملکت اور اسلامی حکومتوں کی سرنوشت، ہندوستانی معاشرے اور عالمی استعمار کی شاخخت اور آزادی اور انصاف کے لئے استعمار دشمن جہاد میں سیاسی، ادبی، فنی، فلسفی اور عملی طور پر شرکت کے بعد اور آخر میں خودشاسی اور معرفت ذات اور تعمیر نفس کے ذریعے اپنی خودی کی طرف واپس آگئے اور خود کو کل اور آج کے تمام انسن و آفاق عالم میں گھما پھرا کر، ایک مشرقی مسلمان اور آزادی پسند مفکر اور اشراقی فلسفی، فنکار مجاہد اور اسلام شناس ادیب بنا دیا۔

یہ ہے اپنی خودی کی طرف واپسی، یہ ہے بیویں صدی میں رہتا، یہ ہے ایک پسمندہ استعمار زدہ مشرقی اسلامی معاشرے میں روشن خیال ہونا۔ یہ ہے ہمارے زمانے کے فلسفہ، کھوکھلے پن، بیکار خیالی، پریشان لکری کی اس بندگی میں مکتب رکھنا اور اصلیل اور استوار اعتقاد پر مبنی جہاں شناسی رکھنا۔ یہ ہے علیٰ صفت ہونا آخر میں یہ ہیں محمد اقبال، خالص مسلمان، ہماری صدی میں فکر اسلامی کی عمارت کی تجدید کے معمرا

میں قوم پرستی کی بیماری میں بستا نہیں ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاریخ  
اسلامی کے سخت ترین حریف سیاسی حالات میں ایرانی تفکرنے یہ دکھادیا کہ اس نے  
حقیقت اسلام کو، اس طرح سے نہیں جس طرح اس کے سامنے پیش کیا گیا، بلکہ  
اس طرح جیسے اس سے چھپا یا گیا، تاکہ تاریخ اس کو بھلا دے، پالیا اور ایرانیوں نے  
آغاز اسلام میں، بنی امیہ اور بنی عباس کے عالمگیر پاریسینڈے کے باوجود اسلام میں  
پامال شدہ حق اور اولین راہ کی تیزی کر لی اور دوسری، تیسرا اور جو تھی صدی میں،  
جو اسلام کے تمدن اور ثقافت کا سنبھالی زمانہ تھا، ایرانی فاطمیات، اسلامی تمدن کی  
ثقافت اور روح اور معنوں کے پھیلاؤ کا سب سے بڑا اور بقول عبدالرحمن بدودی  
مصری واحد عامل تھا۔ اور حیرت یہ ہے کہ آج بھی اسلامی نشانہ ثانیہ کی تحریک اور  
روح، حرکت اور فکر اسلامی اور خوب آلوہ اسلامی معاشروں کی بیداری کا ہے باقی  
اور اس کا پیش قدم سید جمال الدین اسد آبادی ہم میں سے ہیں اور آخر میں اس تحریک  
کو جاری رکھنے والے عظیم علامہ اقبال کا بھی ہم ایرانیوں سے یہ خطاب ہے:

چون چراغِ لالہ سوزن در خیابان شما      ای نوجوانان گم جان من و جان شما  
حلقة گرد من زنید ای پیکران آب و گل      آتشی در سینہ دارم از نیا کان شما  
(میں اللہ کی طرح چہاری کیاری میں جل رہا ہوں، اے گم کے جوانو، میری اور  
چہاری جان کی قسم، میرے گرد حلقة بنالو، اے پانی اور منی کے جسمو، میں لپٹنے سینہ  
میں چہارے بزرگوں کی دی ہوئی آگ رکھتا ہوں)۔

jabir.abbas@yahoo.com  
jabir.abbas@yahoo.com

دوسرا حصہ

حمر اور اقبال

jabir.abbas@yahoo.com

jabir.abbas@yahoo.com  
jabir.abbas@yahoo.com

بعض مکاتب، آثار اور انسانوں کے بارے میں بالکل بات کی جائے، ممکن نہیں دنیا ان کے بارے میں باتیں کرتی ہے۔۔۔ کم و بیش تمام لوگوں نے ان کا نام اور ذکر سنائے اور ان کی یاد ہر جگہ دہراتی جاتی ہے۔ ان سے انکار قطعاً نہیں کیا جا سکتا اور ان کے بارے میں سکوت بھی اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال ان کے بارے میں کچھ کہنا چاہیے۔۔۔ یہ بات میں نے قومی اقتدار اور رہنمائی کے لئے نہیں کی بلکہ اس لئے کہی ہے کہ ہمارے محاذرے کے روشن خیال اور درود مند حضرات اس سے واقف ہو جائیں اور اس کام میں اپنی ذمہ داری کا احساس کریں۔

ادبی صنعت کیا ہے ”گھنٹوں، سالوں باتیں کرنا، صفحوں کے صفحے کالے کرنا اور کتابوں کی کتابیں لکھنا، بغیر اس کے کہ کوئی بات کی جائے جو خود کی اسلوب رکھتی ہے اور اس کی مختلف انواع و اقسام ہیں اور ان میں سے بعض یوں ہیں۔۔۔ مناقب، فضائل، محاسن، مقامات اور کرامات کو ایک صفت میں لانا اور الیسی بلند ترین تعریفوں کو جہیں شاعروں، خیال باغوں اور تخلیل پروازوں کی قوت تخلیل اور سخن و رونوں کی تخلیقی قوت بنا سکتی ہو، ان پر منشار کرنا اور ہر کمال و فضل پر ایک کتاب تحریر کرنا۔۔۔

یہ ہے بات کرنے کا فن اور بار بار اور ہمیشہ بات کرنا اور کوئی بات نہ کرنا۔  
دوسری راستہ پھر وہ کا آدھار رخ دکھانا ہے اور ان کے اتفاق اور تصانیف کے  
بارے میں اس کتاب کی طرح بات کرنا کہ جس کے پہلے درمیانی اور آخر کے صفحات  
گرگئے ہوں۔

یہ سب ہے کہ ان شخصیات میں سے جن کے متعلق سکوت اور خاموشی اختیار  
نہیں کی جاسکتی اور ان کے بارے میں کچھ کہنا چاہیے۔ ہم انہیں سننے شدہ کے طور پر  
ہچکنے تھے ہیں۔

ان سب میں سے ایک علامہ اقبال ہیں جس کا ادبی رخ شاعری ہے بر صنیر  
(ہندوستان و پاکستان) کے فارسی گو شاعر جن کا سیاسی چہرہ سفارت پاکستان سے  
متعلق ہے اور شب اقبال کے عنوان سے گرم، پر شکوہ اور انہم یادوں کی حامل وہ  
محفلیں ہیں جو سالانہ مجموع اور ثقافتی تبادلے اور تعلقات کے معہدے اور خوشنگوار  
ہمسائیگی کے اصول کے مطابق منانی جاتی ہیں۔

علامہ اقبال کی شاعری اور فارسی گوئی کی تعریف کرنا ایسا ہی ہے جسے کہ  
مفکر اور انقلابی پیشوں الو تھر کا دنیا نے عسیائیت میں ایک ایسے انسان کے طور پر جو  
خوبصورت بدن رکھتا تھا اور اس کا خط بھی ہبہت خوبصورت تھا تعارف کرایا جائے۔  
اقبال کا تعارف کچے انداز میں کس طرح کرایا جائے؟ اس سے پہلے ہمیں اپنا  
تعارف کرنا چاہیے، یہ اس سے زیادہ ضروری اور اہم ہے۔ شیخ نے کہا ایک محفل میں  
میں نے چودہ دلیلیں دیں اور خدا کے وجود کو ثابت کیا۔ شمس تبریزی جواب میں کہتے  
ہیں اے شخص، میں اللہ کی طرف سے جناب عالیٰ کا شکریہ ادا کرتا ہوں! اے شخص تم

جاوہر پتے آپ کو ثابت کرو، خدا کو تھارے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے! شمس کی ہدایت ایک کلی اور دامنی قانون ہے۔ خدا، مذہب، تمدن، ثقافت نظریہ، شناختیں، ذہن داریاں، راستے، اہداف، حقوق نیز اشخاص ہماری دنیا کے بڑے مکاتب اور ہماری تاریخ میں کیت و کیفیت کا علم، سب اس وقت ہو سکتا ہے جب فکری سرگرمی، علمی سربندی، بے معنی تحقیقات، کھوکھلا تھیلیاتی بے کار و عبست تعلیمات، باخچہ علوم، بے شر متشققیں، بے مقصد جدوجہد، تنقید، جہاد اجتہاد، درد سے خالی اور بے روح ذوقیات، ذہنی انتقالات، لفظی کھیل اور حقیر علمی دکھاوادہ ہوں، اور ان چیزوں سے دور اور بیگانہ نہ کرے جو حقیقت کی تھی میں اور حقیقت کی گھرائی اور زمانے کی چمک، زندگی، انسان، تکلیف اور ایک نسل کی پچی ضروریات سے ہیں تاکہ ہر کام سے چھپتے ہم خود کو ثابت کرنے میں لگ جائیں اور دیکھیں کہ حقیقی طور پر ہم کیا ہیں اور جان لیں کہ درست طور پر کیا چاہتے ہیں؟

ہم آرٹس کالج کے محقق نہیں ہیں، ارباب علم و ادب میں سے کسی ایک کی شرح احوال کے بارے میں کوئی "تحقیقاتی رسالہ"، "فاضلہ مقالہ" نہیں لکھ رہے اور نہ "تحقیقاتی تحقیقات" اور "عالماں جستجو" انجام دے رہے ہیں۔ مادری زبان سے شدید محبت اور والیگی کا پریجان جذبہ بھی نہیں، جس نے ہمیں اقبال کی بہچان کا گرویدہ بنادیا ہو، مہباں تک کہ علمی ضرورت کے رفع کرنے یا دینی احساس نے بھی ہمیں اقبال کی تلاش میں نہیں بھیجا ہے۔

مقصد یہ نہیں کہ آخر میں ہم یہ سمجھیں کہ اقبال کون تھا اور اس کے پاس کیا کیا تھا؟ یعنی علم برائے علم!

ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس زمانے میں اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اقبال سے کیا کیا چیزیں لے سکتے ہیں؟ مسئلہ یہ ہے ایعنی "ہدایت" ترقی، فلاح اور انسان کے لئے علم اور اس جگہ پر پھر اس کلی، بجز اور عمومی انسان کے لئے نہیں، بلکہ ہمارے لئے جو اس خطے اور زمانے کے اس دور میں اپنی خاص تاریخ، ایمان اور اپنے خاص مقدار کے ساتھ مشخص ہو گئے ہیں اور دشواریاں اور لاچار اپنی خاص ذمہ داریاں بھی رکھتے ہیں۔

عام انسان کی نہیں، ان انسانوں کے متعلق گفتگو ہے جو ایک امت ہونے کے عذان سے مشترک تاریخ و ثقافت و ایمان، درد اور ضروریات رکھتے ہیں اور ناچار اپنے خاص مقدار کی جستجو میں ہیں اور تدقیق طور پر اس خود آگہی نے مخصوص ذمہ داری کو ہماری طرف منسوب کیا ہے۔  
ہم ایک لفظ میں یعنی ہم مسلمان۔

اور اس "ہم" کے وجود کے اثبات کے لئے ہبلا قدم ایک "پی" وجودی خود آگہی "تک پہنچ جانا اور اس سوال کا جواب دینا ہے کہ "ہم اس وقت تاریخ میں کس جگہ پر کھڑے ہیں؟ ان سرحد بندیوں، صفات آرائیوں، محاذا آرائیوں اور مکتوں اور موقوفوں کے اختیار کرنے میں ہمارا مقام کہاں ہے؟ ہم کہاں کھڑے ہیں؟"۔

اگر ہم اپنا "تاریخی مقام" اور "عالیٰ موقف" کا حقیقی طور پر تعین کر سکیں، تو ہم اپنی درست اور صحیح تعریف کر سکیں گے اور اس مقام پر خود آگہی کا جو احساس ہمیں ہو گا وہ سچا اور صادق احساس ہو گا۔ کیونکہ جس چیز کو غالب طور پر ہم "خود آگہی" کہتے ہیں وہ خلط ملط اور گمراہ ہے، اس لئے کہ غیر کے وجود کے بہت سے عناصر نے ہمارے

اندر حلول کر کے تلقینی اور تزیریتی اور تقلیدی اغراض نے ہماری تاریخی فطرت کو آلووہ کر دیا ہے اور "خود" کی بجائے "غیر" نے ہم میں گھر بنایا ہے اور قدرتی بات ہے کہ وہ "خودا گھی" جو استحالة (تبديل) شدہ اور غیر میں مبدل ہو گئی ہو اور خود سے یہ گناہ ہو گئی ہو ایک جھوٹے احساس سے زیادہ نہیں ہے اور اس احساس کے ساتھ جو درد اور ضرورت لپٹنے اندر پاتی ہے وہ ذمہ داری جو کندھوں پر اٹھالیتی ہے، مسائل کے حل کی راہ جو ڈھونڈتا ہے اور انتخاب جو وہ کرتا ہے سب موہوم، بے موقع اور بے معنی ہیں اور بنیادی طور پر درست بھی ہوں، اس میں اور اس کی حالت میں بے بنیاد اور الفاظ کے باریک معنوں میں یہ جاوے موقع ہیں۔

ہمارے تاریخی مقام اور عالی موقع کو یہ سرحدیں متعین کرتی ہیں۔

مشرق: ہم مشرق ہیں اور یہ لفظ صرف ایک جغرافیائی نام نہیں ہے۔ یہ ایک قسم کی بصیرت، جذبے اور رہمان کو بیان کرتا ہے جو ہماری ثقافتوں، تہذیبوں، مذہبوں، طرز ہمارا بینی زندگی و ہماری نوع انسانی میں منحصر ہوتی ہے اور اس وقت یہ وابستگی ہمیں اس کے مقابل جس کا نام "مغرب" ہے مشخص اور واضح موقع بخشتا ہے۔

اسلام: ہم مسلمان ہیں۔ اسلام ہر چیز سے بھلے ہمارے لئے ایک احتمادی مکتب اور ایک معین ایمان اور نظریہ ہے، لیکن اس نظریے میں جو نیا نیا بنایا گیا ہو، اور تازہ تازہ کسی ملت کی جانب سے انتخاب کیا گیا ہو، اور اس نظریے میں جس کے ہمراہ ایک ملت نے صدیوں زندگی گزار دی ہے، فرق ہے۔

یہ وجہ ہے کہ اسلام ہمارے لئے، اسی حالت میں تاریخ، زبان ثقافت،

بصیرت، اخلاق، معاشرتی روابط، جذبہ، طرز عمل، ایک قسم کی جہان بینی اور انسان اور زندگی سے قبول کرنا ہے۔

یہ وجہ ہے کہ اسلام "حقیقت" کے علاوہ، ہماری ثقافت و فطرت کے اجتماعی و جدیان اور معاشرتی تعلقات میں ایک "حقیقت" کی صورت میں موجود ہے اور وہ ذمہ دار روشن خیال افراد جو ہم تک کہ اس کی ایک "حقیقت" کے طور سے نہی کرتے ہیں، ایک سخت اندر ہے پن سے دوچار ہوئے ہیں۔

اگر اس کی "زندہ اور موجود حقیقت" کو معاشرے و ثقافت اور ملت کی تاریخ میں روح اور جوہر سے انکار کریں، اور یہ شہ جانیں کہ اسلام نہ تو ایک "ما بعدالطبعی عقیدہ" جبے دماغوں سے صاف کریں، نہ ثقافت میں کوئی عنصر اور تاریخ میں ایک واقعہ اور نہ ہمارے معاشرے میں کوئی عمارت، جبے بغیر کسی ضرر اور خطرے کے تباہ برپا کر سکیں، اور شہی ہماری انسانی شخصیت پر کوئی لباس کہ جب وہ پرانا ہو جائے تو اسے اتار دیں، اور اسے نئے اور فیشن کے مطابق لباس سے بدل دیں، بلکہ اسلام اس کے علاوہ کہ ایک نظریہ ہے ہمارے لئے تاریخ کا مافیہ۔ ثقافت کی روح اور خصلت، طرز زندگی، انفرادی اور اجتماعی طرز عمل، اجتماعی روح اور آخری جہان کے متعلق ہماری خاص دریافت، ہستی سے ہمارا رابطہ، نیز ہماری اقدار کی عمارت، انسانی اساس اور وجود کی فطرت کی تشکیل دینے والا ہے اور بے شک ذمہ دار، روشن خیال شخص بخوبی واقف ہے کہ عظیم اسلامی معاشرے میں ہمارے لوگوں سے اسلام دور کرنا، ایک المناک قرقی ہے جو انہیں نو دولتے معاشروں اور نئی تعمیر شدہ بے رگ و ریشہ اور خالی ملتوں اور کیفیت زندگی میں مدد

کے لئے محتاج اور تقلید غیرہ مجبور ہونے سک گرددیتی ہے۔

جدید ترکی کا تجربہ نیز نئے رسم اختیار کرنے والی نسل کی قدر و قیمت کا تعین جو اسلامی معاشروں میں ایمان اور اسلامی ثقافت سے کٹ گئی ہے۔ ستمدن دنیا اور مغرب کی ترقی یافتہ ثقافت سے ملچ ہو گئی ہے۔ ایسے معاشرے میں جو اسلام سے تخلیق یافتہ تاریخی، ثقافتی، اخلاقی مافیہ سے خالی ہو چکی ہے۔ ہمیں ہمارے لوگوں کے ہمراہ دکھلا سکتی ہے۔ وہ ہمراہ جو ہر واقف، انسان شناس، روشن خیال شخص کو جو معنی دل رکھتا ہو، ہر چند غیر مذہبی، نفرت اور خوف وہر اس میں ڈال دیں۔

ایک ایسا مفکر جو ذمہ داری سے عاری ہو، اسلام پر اپنا ایمان ترک کر دینے سے اپنے آپ کو اسلام سے آزاد کر سکتا ہے، مگر وہ روشن خیال فرد ہو پہنچنے لوگوں کے سامنے جواب دے ہے اور قوم کی آگاہی، ہدایت اور تنظیم کا ذمہ دار ہے اور لوگوں کے ساتھ تفاصیل و ایجادی اور رشتہ کی تلاش میں ہے اور ناچار تاریخ، ثقافت، زبان اور اپنی قوم کی شاخت کا محتاج ہو، اور معاشرے کی روح، عوام کی فطرت اور اس کے احساسات، قدرؤں اور رجحانات میں گھلن مل جاتا ہے اور سچے طور پر پہنچنے لوگوں کے اندر اخلاص، صداقت اور صمیمیت سے سرشار ہو کر زندگی گزارتا ہے اور ان کے پہراہ سائنس لیتا ہے اپنی آنکھوں کو اس گہری اور توانا و اقیمت سے جس کی جڑیں لوگوں کی تاریخ، روح اور ضمیر کی گہرائی میں ہیں، بند نہیں کر سکتا اور مجردا انگلیش لفظی کی طرح جس چیز کو پسند نہیں کرتا ہو، بیباکی اور لاپرواہی سے دور پھینک دے اور اپنے وجود کو اطمینان بخش دے۔

مسلمان ہونا، ان دو اعتبارات سے، ہمیں دوسرے نظریات کے مقابلے میں

جو انسان کو دعوت دیتی ہیں ایک خاص موقف بخشتا ہے ۔ نیز ہماری تاریخ اور ثقافت کو واضح کر دیتا ہے ۔ ایسی تاریخ جو ہماری حرکت کے راستے کو معین کرتی ہے اور ایک ایسی سرگزشت کو جو ہماری تقدیر کی پیش بینی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے اور ایک ایسی ثقافت کو جو ہماری معاشرتی اور انسانی سرشت کو تخلیق کرتی ہے ۔

تیسیری دنیا: ہم، ہر حال تیسیری دنیا کا جزو لائیں گا شمار کئے جاتے ہیں ۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہم نے انتخاب نہیں کیا اور اس بنابرہ تو ہم اس سے انکار ہی کر سکتے ہیں اور اس سے نظر انداز کر سکتے ہیں ۔

مگر آج تیسیری دنیا کوئی سیدھا سادہ نام نہیں ہے جسے جغرافیائی سیاست دان اپنی زبان پر لاتا ہے، اور یا ایسی جغرافیائی سرحد نہیں جو اسے مغرب کی سرماہی داری اور مشرق کی مارکیٹ سے جدا اور مشخص کرے، بلکہ اس طرح سے جسیے کہ فانون کو اس کی جستجو اور تلاش تھی اور پر جوش اندازوں میں اس کی آرزو کرتا تھا جل کے ایک تیسیری راہ کے مفہوم کو حاصل کرے اور زیادتی کرنے والی دو دنیاوں کے مقابل جو روحانی انسان کی تمام امکنوں کو تا امیدی کی سمت کھینچ لے گئی ہیں ایک اور کوشش اور تجربہ ہو، اور اس بنابر کہہ سکتے ہیں کہ آج ”تیسیری دنیا“ نے اپنے مصدقی کی بہ نسبت ایک وسیع تراور سنجیدہ تر مفہوم پایا ہے اور ہر چند کہ یہ دنیا پسمندہ اور عقب افتادہ ممالک سے مل کر تشکیل پائی ہے اور وہ طاقت، دولت، اسلک، صنعت جو اس کے دو ہمسائے رکھتے ہیں ان سے محروم ہے لیکن یہ دو ایسے بڑے خزانے رکھتی ہے جن سے وہ دو ثروت مند اور طاقتور دنیا تینیں عاری ہیں ۔ ایک تو عمیق اور ثقافت بھری عظیم انسانی ثقافت کی میراث ہے اور دوسرے ان دو حربیوں

کی شکست کا تجربہ ہے کہ ایک نے تو "آزادی" سے قارونی خزانہ پالیا اور دوسرے نے برابری کے ذریعہ "قصر فرعونی" حاصل کر لیا، اور دونوں نے انسان سے ذیل غلام اور صرف کے بت کی درگاہ میں کھوکھلے اور پلید پیر و کار بنائے۔

بیویں صدی:

اس سب کے باوجود ہم، ہمارے روشن خیال افراد بھی، اور ہمارے عوام الناس بھی، اس بیویں صدی میں زندگی گوارہ ہے ہیں اور کم و بیش، مجبوراً اس سے وابستہ ہیں۔ بیویں صدی سے میرا مقصود نظاموں، نظریات، روابط و حالات، فکری ثقافتی، اخلاقی، خصائص اور تمام دشواریوں، بندگیوں، شکستوں، کامیابیوں، برائیوں، اچھائیوں اور خوبصورتیوں کا مجموعہ ہے۔ جبے ہمارا زمانہ اور ہمارے زمانے کے انسان کی زندگی اس دنیا میں بناتے ہیں۔

اس طرف جمہوریت، حریت پسندی، آزادی افراد اور حرمت حقوق انسانی کا دلدلی کیجڑ میں دھکیلہ جاتا ہے اور اس طرف بلند و بالا امگوں اور آج کے انسان کی فطری، حیاتی اور معاشرتی ضرورت کا دلدلی کیجڑ میں دھکیلہ جاتا یعنی سب لوگوں کا زندگی کی تمام نعمتوں اور فطرت کے سرمایوں، انصاف و مساوات سے نفع اٹھانے میں تمام لوگوں کا شریک ہونا ہے۔

یہ ہے معاصر انسان کے پانچ صدیوں کی جدوجہد اور دو بڑے انقلابیوں کا حاصل! اس نے خدا کی پرستش کو جو تمام مطلق و عالی انسانی قدریوں کا مظہر ہے چھوڑ دیا، تاکہ کائنات میں اس تو ناتائی سے، جو اس پر حاکم ہے، آزاد ہو جائے اور عالم وجود

سے تعلق میں بھی اس کی آزادی محدود نہ ہو، اور خدا پرستی سے نکل کر زر پرستی میں جا گرا، اور آزادی، جس کی صدیوں کے بعد پاک ترین خونوں سے آبیاری ہوئی تھی، اس کے پھل کو سرمایہ داری نے چنا اور موٹی ہو گئی اور عورت نے بڑی تکلیفیں اور رنج الماکر پرداہ اور (چادر دیواری کے) حرم کو دور پھینک دیا تاکہ، اپنی آزاد اور انسانی شخصیت اور اہلیت کو دوبارہ پالے سوہ جنس اور جاہلیت کے بے حرمت بازار کی پلیس کھلوٹا بن گئی لذت پرستی مفلوج سازی اور فریب کا آله کار (بن گئی) اور اس کی تمام تر قدروں کا انحصار اس کے نچلے اعضاء (بن گئے)۔

اس نے ایمان کو حصول علم کی امید میں ہاتھ سے دیا، اور علم کو دین کی خدمت سے آزاد کر دیا۔ علم اس کو کھو کھلے ہیں، شک اور تاریک فکری کی طرف کھیج لایا اور اس نے اس کی تمام امیدوں، قدروں اور ایمانوں کو اس سے لے لیا اور ادھ رستے میں اس کو گمراہ اور بے پناہ کر کے چھوڑ دیا اور خود طاقت اور زر کی خدمت میں لگ گیا اور غیر جانبدار اور بغیر سمت کے اور انسان کے مقدار کے متعلق اور مخلوق کی بے چارگی و گراہی درج کے سلسلہ میں بڑی الفہمہ ہو گیا۔

اب اس دور کی مجروم روح اور نا امید انسان کی تلخ دروناک اور دلخراش چیخ کو سنا جا سکتا ہے جسے اس زمین کے دو دوزخوں کے مابین ٹھنگی میں کساجا رہا ہے، وہ چیخ جو اس عصر کے ایک مصنف کے حلق سے نکلی ہے جس نے اپنی عمر کو آزادی اور اشتراکیت کی دو ہشتگوں میں جلایا اور سلک گیا اور تمام عالم کے بادلوں کی رعد برق کو جو اس کی روح کے اندر روتے ہیں، اس کی گھنگو کی آواز میں محسوس کیا جا سکتا ہے، (وہ کہتا ہے)۔

۔۔۔۔۔ وہ سب لوٹ آئے ہیں، خونی اور خاک آلو ڈخنوں کے ساتھ، قبرستان سے آئے ہیں ان میں سے کسی کو بھی ہبھانا نہیں جاسکتا اور ناچار ان کا ایک دوسرے سے امتیاز بھی نہیں کیا جاسکتا، سب کے چہروں پر نقاب چڑھے ہیں۔ ان نے ظہور میں آئے جانوروں کے نقاب ہو وحشت اور غرور سے درندوں کو بھی بھگا دیتے ہیں۔ کیا عباہ و تاریک دیتا ہے! نہ پانی، نہ آئندیہ اور نہ ستارے کی لگا، انہوں نے "تہنائی"، "امید" اور مہماں تک کہ گزرے ہوئے لوگوں کی اچھی یادوں کی نوازش کو بھی ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا۔

"جو انی کے دھوپ بھرے" تپتے دن! وہ دن جب ہماری شبستان کی چھت پر ایک قندیل کی طرح روشن تھا اور تاریکی اور سردی کو جلاتا تھا اور ہم اس کے نیچے عشق کے کیا کیا قسم سے بیان کرتے اور دماغ میں کیا کیا امکنیں اور آرزوئیں پروان پڑھاتے۔ اس کل کی آرزو کہ جس میں، میں اور تم اپنی روئی کو آپس میں تقسیم کریں، آرام سے سانس لیں اور محبت کریں اور خدا کی، جو خوبی و خوبصورتی و حقیقت مطلق ہے اور زندگی اور اس جہان کو معنی دیتا ہے، عاشقانہ طور پر پرستش کریں۔

"مگر۔۔۔۔۔ اب وہ خونی اور خاک آلو ڈخنوں کے ساتھ قبرستان سے لوٹ آئے ہیں۔۔۔۔۔ عشق، آزادی، مساوات، اگھی، صلح، عوام، خوبصورتی، خیر، حقیقت، کمال، ایمان اور قدر کے الفاظ سے ایک مرثیہ بناؤ خدا کے لئے اور انسان کے لئے ① مگر خدا

1- Chandell , (AHD) Les murmurs d'une ame solitaire, Paris, Rosas, P-27

”لایکوت“ ہے اور انسان اس کا ہم چیمان و ہم عہد اس کی روح کا حامل، اسکی طرف صاحب رسالت، اور آخر میں اس معنی دار اور مقدس فطرت میں اس کا جانشین، جو خدا کی قدرت، عقلمندی اور حسن کا آئینہ ہے اور ایک ایسا زندہ و خود آگاہ چیکر ہے جو خدا کی روایات پر گردش کرتا پرورش پاتا، جتنا جاتا اور جنتا ہے۔

..... اور اس طرح دنیا میں یہ خدا صفت آزاد و آگاہ اور خلاق انسان جس کے قدموں میں سب فرشتے سجدوں میں گرے ہیں اور زمین و آسمان اور ان کے درمیان جو کچھ بھی ہے وہ اس کے سکھن ہیں جو حقیقت، حسن و خیر کو دانش وہیز و اخلاق سے شکار کرتا ہے جو عظمت کی تعریف کرتا ہے اور قدروں کی پرستش کرتا ہے، اور آزادی کو تلاش کرتا ہے اور ”عالم آگہی“ سے ”خود آگہی“ اور اس سے ”خدا آگہی“ تک ہبھتا ہے اور پھر روزمرہ زندگی گزارنے سے ”ابدیت“ اور ”کثرت“ سے ”وحدت“ اور ”مناقشوں“ سے ”ذات“ اور ”دنیا“ کے پست رجحان سے دیکھنے، سوچنے، انتخاب کرنے، جانے اور زندگی گزارنے اور ہونے میں ..... آنحضرت کی دور اندیشی اور بلند رجحان، ”محاش“ سے ”معداد“ کو اور ”شرک“ سے ”توحید“ کی طرف جاتا ہے ① اور تمام عمر ہر رات اور دن پانچ مرتبہ میں سے ہر بار جب حق کی سلطنت کا ڈنکا بام عرش پر بجا یا جاتا ہے وہ ہر ٹکییر کے ساتھ تمام جھوٹی عظموں اور ذلیل کربیائیوں کی تحقیر کرتا ہے اور ہر بار تاکید کے ساتھ ”اس“ سے مخاطب ہو کر اور تمام طاغوتوں کے لئے اعلان کرتے ہوئے اور خود کو الہام کرتے ہوئے یہ تکرار کرتا ہے کہ: خاص حمد و شنا، تعریف، شجباء اور لئیم ارباب کے لئے مخصوص ہے، بلکہ رب رب رحمٰن و رحیم

1- ملاحظہ ہو: ”معراج و اسراء،“ ”النقبالی خود سازی“ کی کتاب میں۔

ہمدردی اور تقدیری ہم آئنگی اور آخر میں ایک تو حیدی نظریے کے طور پر اس کی اولین بنیادوں پر مذہبی اور اسلامی بصیرت کی عمارت کی تجدید کے متعلق گفتگو کی اور علامہ اقبال کے بارے میں کوئی بات نہیں کی علامہ اقبال کے متعلق گفتگو نہیں کی، لیکن یہ سب اقبال ہی تھے جو بات کر رہے تھے۔

سنت ابراست کہ گیر دا ز بحر آب      باز ہمی سوی بحر قطہ باران برد  
 (بیادل کا طریقہ یہ ہے کہ سمندر سے پانی پالیتا ہے اور دوبارہ بارش کا قطہ بحر کی طرف لے جاتا ہے) یہ وہ تمام درس ہیں جنہیں ان مکتب میں سیکھا جاسکتا ہے وہ ہے جس نے سید جمال الدین کے انقلابی بغاوت کو "نظریاتی" بنیاد بخشی اور اس کے میوہ دار اور سرکش درخت کو گہری فکری جڑیں دیں۔

مشرق کی طرف واپسی ہو جہنوں نے ہمارے زمانے سے قربی گہری اور صحیح واقفیت حاصل کرنے، مغرب کے فکر کی بلند ترین افقوں پر پرواز اور اس مکتب میں جس کے استاد ہیگل، ناطشہ، کافٹ اور گونئے جیسے ثقافت کے فطیں جو ہے تھے، سالہا گھل مل اور سیکھ کر، جدید یورپی ثقافت کے فکر و فلسفہ کے سیسے کا جسم رکھنے والے ہمیں کو ہمارے خدائی نامہ کے رسم و ستان مولانا (جلال الدین روی) کے قدموں میں لا ڈالا تاکہ عشق کے سورج کے تیر سے اسے اندھا کر دے اور اس نے خود اس "یزدانی پیر" کی ہدایت سے بے روح و بے نور صد افلاڈی برج (ایفل ناور) کو پیرس میں اور اس کے پتھر سے بننے انصاف کے نابینا مجسہ کو فرنگ (مغرب) میں چھوڑ دیا۔ اور منار والے آسمان جس کی تمام ہستی ایک "فریاد کا حلق" ہے اور جس کی تمام عمر ہر صحیح و شام ایک دعوت کی تکرار ہے لیکن دلدل سے خدا کی طرف معراج انسانی کی دعوت پر

صحیح کے راستہ پر قدم رکھا اور صحیح کی سفیدی کی چوٹی سے اوپر گیا اور دیپے فلق سے خود کو عرفان کے سمندر کی بے قرار ماضی طب امواج میں پھینک دیا اور مشرق کی طرف لوٹ آیا اور جب ساحل اسلام سے سرٹکالا اور قرآن کے سہارے سکون پایا تو کہنے لگا: "افسوس ان سالوں پر جو میں نے فرنگ (مغرب) میں لا حاصل و بے شرط حاصل کر دئے" ①

یورپ کا فلسفہ اور سائنس اور انسانی قدریں، یورپی زندگی اور احساس کی سبب بے روح اور آبرو ذہن کے نام کی مصنوعات ہیں وہ ذہن جس کا حساس ترین اور صادق ترین حصہ ایک فنٹوگرانی کا کمیرہ ہے جو فطرت، زندگی، حرکت اور انسان کی الیسی تصویریں کھینچتا ہے جو جان، جوہر اور عشق سے خالی ہیں اور اگر ہم دیکھتے ہیں مغربی بصیرت میں نہ صرف سائنس بلکہ فلسفہ، فن، حسن شناسی اور حتیٰ انقلابی نظریات بھی انجام کار میکنالوچی پر آکر ختم ہو جاتے ہیں، تو یہ کوئی حادثہ و اتفاق نہیں ہے۔

مشرقی نظر، نہ صرف انسانی قدریں، روح کے جلوؤں اور حسن و کمال و رفعت کو بلکہ احساس کی فطرت اور مادی مظاہر کو بھی ایک قسم کے ملکوتی منظہ اور معنوی آیات کے آئینیے کے طور پر دیکھتی ہے۔

حسن شے کو مانیت، "مادی جبر" اور "مادی شے" کا نام دیتی ہے۔ اسے قرآن "سنت خدا" اور "آیت خدا" کہتا ہے اور اصلی وجود، ارادہ خود آگاہ، خلاق قوت

۱۔ اقبال در راه مولوی از ڈاکٹر اکرم لاهور صفحہ ۲

اور باشور حرکت کے عنوان سے خدا کے اثبات کے لئے، اس کا اثبات کرتا ہے اور فطرت کو ایک خود گنود کام کرنے والی اور سنگل میشین نہیں بلکہ عالم شہادت سے تعمیر کرتا ہے اور اپنی پاک سورتوں کے نام سے تو فرشتوں اور نہ ہی ماقوٰں الفطرت اور حتیٰ فلسفی اصلاحات پر بلکہ تمام عینی، واقعی، تاریخی، انسانی، عملی، فطری ناموں سے اختیاب کرتا ہے۔ آفتاب، رعد، نور، دھواں، طور، سارہ، چاند، لوہا، گار بروج، سفیدی، سچ، شب، زلزلہ۔

آیا فیر باخ جو کہتا تھا ”خدا اپنی بے نیازی اور طاقت کو اپنے پرستاروں کے نظر، ناداری اور کمزوری سے حاصل کرتا ہے اور انسان خدا کی پیری وی اور پرستش میں خود سے خالی ہو جاتا ہے اور اس کا رادہ مخلوق ہو جاتا ہے اور وہ خود سے یہ گاہ ہو جاتا ہے اور مارکس جو کہتا تھا: ”دینی فلاکٹ، آہ ایک بے چارہ وجود، ایک سنگل دنیا کا قلب اور ایک بے روح وجود کی روح ہے اور لوگوں کی افیون ہے“ کیا درحقیقت انہوں نے ان قطعی احکام کو صادر کرنے کے لئے اس کتاب کی جس پر دنیا کے ہر پانچ افراد میں سے ایک ایمان رکھتا ہے چند چھوٹی سورتیں پڑھنے کی بھی خود کو زحمت دی تھی؟

وہ حق جس کا فیصلہ نہ عوام کے طرز عمل (کردار) اور نہ خواص کی گفتار سے ہو، بلکہ حقیقی اور اصلی متن و قابل استناد استاد سے براہ راست تحقیق کر کے حاصل کرتا ہے جب وہ مذہب کے مستقل بات کرتا ہے کیا وہ یہ کر سکتا ہے کہ قرآن پر جو کم از کم تاریخ اور مذہبی شاخات کے نقطہ نظر سے ہماری دنیا اور تاریخ کے عظیم ترین ادیان کے تین چار مستند متنوں میں سے ایک ہے، ایک نگاہ بھی نہ ڈالے؟

ہم آگاہ، اصلی، اور ذمہ دار روشن خیالوں کو جو دنیا کے اس طرف رہتے ہیں  
 یہ سمجھنا چاہیے کہ اس طرف والے بنیادی طور پر ہمیں نہیں سمجھتے اور اس سے بڑھ کر  
 کسی لیے کا وجود نہیں کہ ہمارا روشن خیال فرد اپنے آپ کو دیکھنے کے لئے ان کی  
 عینک آنکھوں پر لگائے اور اپنی ثقافت، تاریخ اور ایمان کو عینی تمام انسانی مافیہ اور  
 اپنے وجودی شخص کو سمجھنے کے لئے ان کے ذہنی سانپھوں اور ان کے فکری اسلوبوں  
 اور تعبیری اور قبول و قہیم کی شعوری طور پر اور اس سے بھی بدتریہ کہ غیر شعوری  
 طور پر تقلید کرے۔

علامہ اقبال دنیا میں ایک قسم کی علاقائی موقف گیری کے عنوان سے شرق  
 زدگی سے دوچار نہیں ہوتے ہیں؟  
 اقبال اپنی ذات کی طرف والپی کے ساتھ یہچے کی طرف اور رجعت پرستاں  
 سفر کی دعوت نہیں دیتے۔

اقبال مغرب کے خلاف اس تمام شدت اور گری سے محاذارانی کے باوجود  
 قوم پرستی کے مرض میں بیٹلا نہیں ہوتے اور اس بیماری کو خاص طور پر بیسیوں  
 صدی کے آغاز کے ہر منی سے سوگات کے طور پر نہیں لے کر آتے ہیں؟  
 اقبال اپنے تمام دینی جوش و ولے کے ساتھ جوان میں تھا، قرآن کی سست  
 والپی کے نعرے اور ہیگل، نطشہ اور انیسویں صدی کے سائنسی فلسفوں سے دشمنی  
 اور خدا، اسلام، محمد، علی، فاطمہ، حسین سے عشق نے انہیں ایک دینی تعصب میں  
 گرفتار نہیں کیا ہے اور اس طرح کی بصیرت، انحرافی محاذارانی اور رجعت پرستی اور  
 کہنہ پرستی کی تعریف کرنا نہیں ہے؟

خصوصیات کے ساتھ ہمارے لوگوں کے درمیان سے ابھرائے اور اس نے فکری، ثقافتی، ادبی اور شخصی اور سیاسی کے طور پر انسانی اور معاشرتی شخص پایا ہے۔ ہمارا روشن خیال ہمارے معاشرے کے قدرتی اور اس کے تاریخی تغیر اور ثقافتی نشوونما اور ترقی سے بیوستہ نہیں ہے۔ وہ ہماری ثقافت، مذہب، اخلاق، فکر، جماليات، حذہ، فکر، قدر، تاریخ، معاشرہ اور انسان میں کوئی بھی معنی سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ بنیادی طور پر ایک خاص قسم کی "سمجھ" کو اس کے دماغ میں اتار دیا گیا ہے کہ جس سے ہمائی انسان نہیں ہے اور جب تک اس سمجھ اور اس تبدیل شدہ عقل کو سرطان کے خون کی طرح اس کی رگ جان و دل اور ضمیر سے باہر نکلا جائے اور صحت مند حیات بخش خون داخل کیا جائے تو کوئی بھی چیز تبدیل نہیں ہوگی۔

ان الله لا يغير ما بقوم حتى يغيروا امباً نفسم (سورة رعد آیہ ۱۱)

(اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہیں بدلتی) اس جگہ "ما بآنہم" کی تبدیلی تجہ اگری و سعیت حاصل کر لیتا ہے۔ اقبال کو سمجھنے کے لئے بھی ہمیں اپنی فرنگی فہم بدلتی ہوگی۔

اسلام بغیر اس کے کہ یہ چاہے کہ تاریخ میں سائنسی قوتیں اور معاشرتی عوامل کی نفعی کرے، اجتماعی نظام کی قسمت کے تعین اور اس کے تغیر میں واقف کارانہ، آزاد، عمل کی طاقت انتخاب کی صلاحیت رکھنے والے انسان یعنی ذمہ دار انسان سے براہ راست مخاطب ہوتا ہے۔

اسلام کی زبان میں "ایمان" اور "عمل صالح" پر انحصار کچھ ناقابل تکلیف

صورت میں بار بار آتا ہے جو یہ دکھاتا ہے کہ اسلام معاشرتی حالت کے تغیر کو انسانی کیفیت کے تغیر کا محلوں شمار کرتا ہے اور انسانی حالت کے تغیر میں "اعتقادی آگہی" اور "انقلابی عمل" پر انحصار کرتا ہے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں انسان کے اندر کی اصلاح اور عظمت اور ذمہ داری کا وزن، وہ بھی اس کی معاشرتی حالت اور زندگی کی روش اور بنیاد اور اس کی تاریخی تقدیر کے مقابل آشکار ہو جاتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ اسلام ایک ملت کی سرنوشت کے بھاری بوجھ کو انسان کے کاندھے یعنی انسانوں کے ارادہ خود آگاہ پر ڈالتا ہے اور روشن فکر فرد تاریخ میں تبدیلی آور، تعمیری اور راہ سنائی کرنے والا فریضہ رکھتا ہے اور نیز اسی کی دلیل سے عہد کرنے والا بھی ہے اور ذمہ دار بھی۔ اسی لئے اسے اپنے معاشرے کی پریشانی غربت، انحطاط اور اسی کے گناہ کا بار بھی اپنی گردن پر لے لینا چاہیے اسی بنا پر موسیٰ اور ابراہیم کے کردار میں اسی کی تجلیل و میزالت محتقول اور جائز روا ہے جس قدر فرعونی اور نمرودی کردار میں اس کی سرزنش۔

یہی سبب ہے کہ علامہ اقبال نہ صرف عظیم مفکر، زیرک ترقی پسند اسلام شناس، ایک استثمار دشمن عہد کرنے والے مجاہد اور اپنے زمانے میں مرد حرف کت و عمل کے عنوان سے۔

اپنے لوگوں کے مقابل اپنی اصلی جائے انحصار کو اپنی ملت کی ذہنی، روحانی اور وجدانی تغیر (یغیر و اما بانفسہم) انتخاب کرتے ہیں اور وہ لوگ جو معاشرتی عمل کو صرف بدنی عمل یا سیاسی عمل کی شکلوں تک مخصر نہیں جلتے، وہ

بطور عمیق اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ ذمہ دار روشن خیال شخص کا بنیادی ترین عمل یہی ہے ۔

اقبال پہلے مرحلہ میں ایک خاص اور نادر جہاں شاہی کو پیش کرتے ہیں جس کا سمجھنا جس قدر جدید اسلامی معاشروں کے روشن فکر شخص کے لئے، جس نے اپنی ذہنی پرورش اور فہم و اور اک کے ساتھوں کو مختصر ثقافت اور نظریہ سے لیا ہے، دشوار ہے اتنا ہی حیاتی بھی ہے ۔

یہ جہاں شاہی جس قدر نئی ہے اتنی ہی ہماری دیرینہ ثقافت و ایمان کی گہرائیوں میں جڑیں رکھتی ہے اور ہمارے لپٹے دور ترین معنوی سرچشموں سے سیراب ہوتی ہے ۔

جہاں شاہی:

اقبال کی جہاں شاہی کی بنیادی ترین امتیازات میں سے ایک ان کا فلسفے کے خلاف حمد ہے ۔ اسلامی ثقافت کی تاریخ میں یہ موقف گیری بنیاد رکھتی ہے، یونانی فلسفے کا وارد ہونا جس قدر اسلامی فکر و ثقافت میں، خاص طور پر تیسری صدی کے آخر میں فاتحاء تھا اور اس نے صرف این سینا، رازی اور ابن رشد جیسے فلسفیوں پر گون کوشکار کر لیا بلکہ ہماری ثقافت میں تفکر عقلی کی طاقت ور ترین روکو وجود میں لایا۔ لیکن قرآن کی اصیل بصیرت اور جہاں شاہی کو بدلتا دیا اور یہ تغیر اسلامی فکر و ایمان کی حرکت کے راستے کے انحراف میں تعین کننہ تھا اور اس کا سب سے بڑا اثر اسلام کا تبلیغ ہونا، ایک عواید دعوت اور معاشرتی تنظیم اور سیاسی رائہمنانی کے حصول کی

سمت میں انقلابی حرکت اور امامت و انصاف پر مبنی معاشرتی نظام کی تخلیق ایک پیش رفتہ ترقی یا فتنہ فلسفیہ، سائنسی ثقافت کی صورت میں تھی۔

اگرچہ وہ تمام گروہ جو حکمت حرکت یا فلسفہ عقلی کے خلاف امکھڑے ہوئے ترقی پسند نہ تھے، مگر ایک ہوشیار راش، ترقی پسند اور اصیل مزاحمت بھی موجود رہی جس کا مقصد زاویہ نگاہ، طرز فکر و خاص فہم اور اصلی اسلامی جہان شناسی سے وفادار رہنا رہا ہے اور بیک وقت یہ ظاہری متعصبانہ فرقہ واری اور عقلی روشن نگاہی سے خالی غلطیسیت سے دور ہے جو صرف "تعبدی" اور "تلقیدی" ہو اور فلسفے سے اس کا مقابلہ، مذہب میں سلطان عقلی رجحان کی مخالفت نہیں ہے بلکہ "اسلام کی یونان زدگی" کے باوجود کرنے والے عظیم المیتی کی نسبت گھری خوداگبی سے نکلتی رہی ہے۔

"اقبال" کا فلسفہ مخالف موقف گیری ایسی گھری اور اصیل روایت کا بناندہ ہے جو ہماری فکری نکراؤ اور اعتمادی بھگوں کی پوری تاریخ میں تسلسل رکھتی ہے۔ الغرض یہ قدیم لوگوں کے کام کی ایک تلقید اور تکرار نہیں بلکہ اس کا ارتقاء اور ایک ایسی ہوشیاری، تعمیری، ثبت اور زندہ ماہراں حماد آرائی ہے اس چیز کی بنیاد پر جو ہمارے زمانے میں گزر رہی ہے یعنی ماضی کی یونان زدگی کے خلاف حقیقتی اور اصیل مزاحمت کا ایک منصوبہ اصیل فکر و ثقافت کے مقابلے کی شکل میں آج کی غرب زدگی کے خلاف جہاد میں جس سے ہم دوچار ہیں اور مٹ جانے و سُکھ جانے کے خطرے سے دوچار ہو رہے ہیں۔

ضمیر ترپ رہا ہے فلاطون میان غیب و حضور اذل سے اہل خود کا مقام ہے اعراض  
ترے ضمیر پ جب تک نہ نازی نہ صاحب کشاف گرہ کش ہے نہ نازی نہ صاحب کشاف

کیوں؟ یو نافی یا یورپی عقلی فلسفے پر اقبال کو کیا اعتراض ہے۔

وہ ایک "روحانی سفر" کے دوران ڈالنے کے الہی کامیڈی کے اسلوب میں معاصر مغرب کے فلسفیوں کی مذاہدگی میں ہیگل کو مولانا روم ، مشرق کی سرزمین کے اس رسم دستان سے جگ کے لئے بلاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ مغرب کے فکر و اندیشے کے سیہہ کا بدن رکنے والے اسفندیار ہمارے ہمروں کے تیرے جو "سیر غ" سے مدد طلب کرتا ہے اندھا ہو جاتا ہے اور خاک پر گر جاتا ہے ۔ اب ہماری فہم اس راز کے نزدیک ہو گئی ہے جو اقبال کی گفتگو میں موجود ہے ۔ ہماری جہان شناسی مغربی جہان شناسی کی طرح خشک ذہنی صورتوں اور دنیا کے انفعانی انکاس اور فطرت کی مجرد و بے روح ، بے جوش و جذبہ تصویریں نہیں ہیں ۔ یہ حقیقت سے براہ راست رابطہ کی ایک قسم ہے ۔ یہ احراق (اگ لگنے) کے فارمولے کا انشاف نہیں ہے ۔ اگ پر ہاتھ رکھتا ہے اکاتیات میں گھل مل جانا ، ہستی کی روح سے جرم جانا اور انسان کا زندگی کے جاری متن اور فطرت کی حرکت میں داخل ہونا یا فطرت کی زندگی اور حرکت کا انسان کے وجود کی گہرائی اور انسانی حیات کے خون میں جاری ہونا اور نتیجے کے طور پر ایک نوع کے جذب اور دو وجودوں کی مقناطیسی کشش میں کھو جانا ، یہ اہتمائی چھوٹا جب "بے اہتمامی" کے سامنے قرار پاتا ہے اور بقول ویکٹر ہو گو: نماز یہ ہے! ساسس نہیں یعنی بیرونی کی اطلاع جو ایک قسم کا کشف و شہود ہے ، اور حریت کو حاصل کر لینا ، شکوہ ہستی اور حسن فطرت کے احساس کے سامنے حریت اور آفریکار بے تابی ، خود جوشی ، خود سے گزرنا اور خود شکنی اور خود سے باہر نکل کر پرواز کرنے لگنا اور وصال زندگی کے اصلی مرکز سے یہ یوں سمجھی حرکت عالم ،

وجود کا ترتیب دھر کتا دل، ایک ایسی روح کہ یہ ہست سے نقش والی عظیم فطرت جس کا پیکر ہے ۔

ایک نظری سائنس نہیں، کھوکھلی بے جوش و خروش اور تاثیر پذیر ذہنی کھیل بلکہ اس کا ایک عکس بکھر نے والا اور دگر گوں ساز نور جو باطن کی عجائبات بھری دیتا کو روشن کر دیتا ہے اور اس میں آگ لگا دیتا ہے ۔ ایک تباہ کن حملہ آور اور خلاق دانش ایسی دانش جو دنیا کا نقشہ بنادیتی ہے اور انسان کو ایک اور خلقت بخشتی ہے ۔ مرے لئے ہے فقط دور حیرتی کافی ترے نصیب فلاطون کی تیزی اور اس مری نظر میں ابھی ہے جمال و زیبائی کے سر بجھہ بین قوت کے سامنے افلاک نہ ہو جلال تو حسن و جمال ہے بے تاثیر ترا نفس ہی اگر نغمہ ہونے آتش ناک قدیم یا جدید فلسفیانہ جہاں شہاسی میں دنیا ایک مجموعہ ہے واقعوں، حقیقتوں، جوہروں، "اعراض"، "صیولا" و "صورت" و "مادہ" و "مرکب" و " مجرد" و "افلاکی" و "لاہوتی" و "ناسوتی" و "محوس" و "معقول" و "علت" و " محلول" و "اثری" و "ثبت بار" و "الیکڑوں" و "پروٹوں" و "فوٹوں" و "اسٹر" و " حرکات" و "روابط" و "کشش" و "دافعہ" کا اور انسان اس مجموعے کے مقابلے میں ایک "ذہن" ایک آئندی ہے کہ جو کچھ ہے اور جو کچھ گزرتا ہے اس کی سچی جھوٹی یا طاولی و نہیں و رنگ و زنگ سے ملی ہوئی تصویریں اور نامہواریاں، آلو دگیاں، غبار، دھبے، ریشے، بال، شیوھے پن اور آئندی کے بے جا ہونے (سب) اس میں منعکس ہوتا ہے اور یہ سائنس ہے، اطلاع (ہے) ۔

انسان اور کائنات کا رابطہ، رابطہ "ذہن" و "عین" ہے اور جو کچھ کہ فلسفی، عین حقیقتیں اور علی حقائق خیال کرتا ہے جو سوائے اس کی اپنی فہمیات کے کچھ

نہیں، اسے عالم وجود سے براہ راست سروکار نہیں ہے اس کے ساتھ صاف اور سچا پر خلوص اور صادقانہ (طور پر) نزدیک رابطہ نہیں رکھتا جو کہ بلا واسطہ اور بے پرده ہو، وہ اپنی سوچوں سے کھیلتا ہے اور اس سرگرم کرنے والے اور فریب و مندہ کھیل کا نام فلسفہ ہے۔ وہ اپنی اور فطرت کی ہستی کا مجسس خبر ہے مگر بیکار منفی اور منفعت ہے فلسفیانہ آگئی "خبر" ہے۔ خبر روپوں اور کھالوں (ظواہر) کی اطلاع ہے۔ عرفانی آگئی "سوراخ" کر دینے والی اور "کھال شکافتہ کرنے والی" آنکھ ہے کہ اس کی لگانہ نشرت کی طرح اشیاء کے تن میں اور فطرت کے پیکر کے اندر داخل ہو جاتی ہے اور کائنات کے دل میں اتر جاتی ہے اور ہستی کی روح کو چھو لیتی ہے، وہ لگانہ جو رنگوں میں مشتمل نہیں، ہو جاتی، چیزوں کے وجود میں سرگروائی و حیران نہیں ہوتی، رویوں اور واقعات میں خمہری نہیں رہتی اور اس قسم کی اطلاعات اور خبروں کا ذخیرہ اس طرح کی پیاس کو نہیں بھاتا اور فلسفیانہ عزور میں گرفتار نہیں ہوتا۔ وہ "اہل خبر" نہیں بلکہ "اہل نظر" ہے۔ وہ نور کی جان میں آنکھ کھولتا ہے اور حقیقت کے لئے بے قرار ہے نہ اطلاع کے لئے بلکہ وصال کے لئے اور نہ خر کے لئے بلکہ نظر اسے سراب کر دیتی ہے۔

زمانہ حقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ  
کے خر کے جنون خود ہے صاحب اور اک  
خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں  
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں  
اور یہ اقبال ی ہیں جو عشق کی پرخون راہ کے مولانا (روم) سے جس کا نور

واضح دیکھنے والی میٹی ہے، یہ پوچھتے ہیں:

خاک تیری نور سے روشن بصر غایت آدم "خبر" ہے یا "نظر"؟

اور وہ جواب دیتا ہے:

آدمی "دید" است باقی پوست است دید آن باشد که دید دوست است (یعنی آدمی صرف "دید" ہے باقی کھال ہے اور "نظر" وہ ہے جو دوست کی نظر ہو) اس مکتب کی بصیرت، تناقض اور خاص کلمات سے واقفیت حاصل کرنی چاہیے اور اس راہ میں چہلے قدم کی شرط یہ ہے کہ تمام ذہنی سانچوں اور مذہبی فلسفی اصطلاحات جو اس میں سخت رائخ ہو چکی ہیں فہم کی گہرائی اور اسلوب منطق سے صاف کریں اور دھوئیں۔

یہ "نظری آگہی" اس "خبری آگہی" کے مقابل کس طرح کی اور کہاں سے ہے ؟ ظاہر کہ یہ آگہی "نظر" کا تحفہ ہے مگر "نظر" جو "دیدہ بینا" کا کام ہے، کیا ہے ؟ اقبال خود اس کے معنی بتاتے ہیں: "علم حاضر" کیا ہے ؟

یہ "خون کی ندی" جو دیدہ بینا سے جاری ہے کس چیز کو بیان کرتی ہے ؟ "بینائی" اور "خون" کے اس مکتب کے اندر آپس میں کیا رشتہ داری ہے ؟ یہ مقام ہے جہاں مسئلہ شاخت و "آگہی خود" کو "فلسفی علمی" و "عرفانی" ، "دینی" جہاں شناسی میں دو واضح چہروں کے ساتھ دکھلادیتا ہے - فلسفی علمی آگہی اپنی اسی "خبری" سرحد پر ٹھہر جاتی ہے ، انسان اور عین حقیقت کے درمیان ایک رابطہ ذہنی ، رابطہ کے عنوان سے عالم و معلوم کے درمیان رابطہ ہے مگر عرفانی دینی جہاں شناسی میں علاوہ اس کے شاخت کا جوہر ایک اور رنگ میں ہے ، حقیقت کے متعلق خبر پانا نہیں ، ذہن میں اشیاء کی صورت کا وجود نہیں

ہے، حقیقت کا دیدار ہے، حق کو وجدان کرنا اور اپنے فیصل ارادے میں تجربہ کرنا اور دل کی گہرائی میں پالیتا ہے۔ اقبال کی خودی کا راز یہ ہے اس کے علاوہ کہ عرفانی، دینی آگہی فلسفی، علمی آگہی کے مقابلہ میں ایک اور نوع سے ہے جو شے اے مشخص اور واضح کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس آگہی کی سرشناس تین عناصر ”درو“، ”عشق“ اور ”عمل“ سے بنی ہے۔ وہ تین عناصر جن سے ہیگل کا پچیدہ فلسفہ اور فرانس بیکن کی ”خ شب علی آنکھ“، ”محروم“ ہیں اور جدید زمانے کے باقور رت تمدن کو اس طرح سے سخت، روکھا اور بے روح اور ترقی یافتہ آج کے انسان کو سردو، پھر اور بیک وقت اتنا زیادہ ضعیف اور نقصان پذیر بنا دیا ہے وہ انسان جو مسٹریل سیکون کی تعبیر میں موت کے پیش جانے کے علاوہ کسی چیز کے انتظار میں نہیں ہے۔

ہم پیدائش اور ہم نسل آگہی، درد، عشق اور عمل کے ہمراہ ہے۔ درد رفاه و آسانش کی جستجو میں انسان اور کمال کی جدوجہد میں انسان کے درمیان سرحد کو نیز دو عقولوں، دو تمنوں، دو ثقافتوں، دو ہمزوں، دو انواع زندگی اور آخر کار دو متفاہد علوم کو متعین کرتا ہے۔ وہ سائنس جو بیکن کی تعبیر میں حقیقت کی طلب میں تھی اور اب طاقت حاصل کرنے میں مصروف ہے، وہ سائنس جو روٹی کا کوپن دیتی ہے اور وہ سائنس جو جان بخشتی ہے ایسا علم جو جبر کو جنم دیتا ہے اور وہ علم جو نور سے تابندہ ہے، علم واقفیت شناسی اور علم حقیقت پرستی ہے۔

علامہ اقبال کی تعبیر میں انسان بولی کی مانند آگہی میں مجتسس اخباری رپورٹر ہے، وہ فطرت نام کی چیز کے جائزے پر کھدا ہے اور جہاں نام کے دیسیع قبرستان میں قدم زنی کرتے ہوئے خبر حاصل کرنے اور اطلاعات کو اکٹھا کرنے کے

درپے ہے۔ اطلاعات کا جمع کرنا اور "علی صفت آگھی" میں انسان ایک بے تاب پیاسا بے قرار قیدی اور ایک عاشق ہے۔ اپنے دوستوں اور وطن کے بھر میں پڑا ہے اور اپنی نیستان (بانسوں کے جنگل) کی جستجو میں، حقیقت کو معلوم کرنے، گشیدہ کے پانے، سرچبہ تک پہنچ جانے اور آخر کار حرم آشنا تک راہ پانے، دوست کے حرم میں وارد ہونے، میقات میں اس کا دیدار اور میجاد میں حاضری کے درپے ہے۔ اس مکتب میں علم یہ ہے، درد یہ ہے، عشق یہ ہے اور آخرش فطرت اور ایسے آدمی کی فطرت رکوع و بجود یہ ہیں ① :

گفت پیغمبر رکوع است و بجود بر درحق کو فتن حلقہ وجود  
اب ہم ایک اور قسم کے فہم کو جو ہماری مشرقی ثقافت میں جڑیں رکھتی ہے  
اور مذہب کے اصیل جوہر سے رشتہ رکھتا ہے، محوس کر سکتے ہیں اور سرد، بانجھ و  
ستفول فلسفیانہ عقل کے سامنے سہروردی کی خوبصورت، گہری تعمیر میں ایک  
"سرخ عقل" کی بات کر سکتے ہیں، دینی پر شعلہ، حجم دیتے والی اور سرگرم عقل جو  
کائنات کی اصل میں نفوذ کرتی ہے اور دنیا کی روح سے گھمل مل جاتی ہے اور پیاسی،  
بے آرام اور حقیقت کی مٹلاشی ہے اور باطن میں بھی ایک وجودی انقلاب بپاکرتی  
ہے اور آدمی کی فطری معاشرتی، طبقاتی اور تاریخی خلقت میں عین ترین تبدیلیاں  
وجود میں لاتی ہے اور اس کے وجود اور زندگی میں حسن، قدر، بلندی و آزادی وجودی  
کو اندھی جملی کششوں نفع، ترقی، حیوانی بھوک مٹانے کا جانشین بناتی ہے اور بندر

۱۔ ملاحظہ درحق کو فتن حلقہ وجود (وجود کے حلقہ کو حق کے درپر پہنچنا) کتاب خود سازی (انقلابی میں) (۱) ۔

بنا انسان سے خدا بنا انسان خلق کرتی ہے۔

مگر یہ خدا بنا انسان اپنی زمینی تقدیر کے سبب ایک مٹی کا وجود ہے۔ اسلام اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کو خاک "کچڑ" اور "سیاہ کچڑ" سیالب کے سخت شدہ تلچھت سے گوندھا گیا ہے۔ یعنی بندر کے ساتھ ایک گھر میں ہم نشین اور جانوروں کا ہم نسل بیک وقت وہ روح خدا کو اپنے اندر رکھتا ہے اور خدا کی خاص امانت کو ہاتھ میں لئے خدا سے معابدہ فطرت کر چکا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اپنے وجود کے ایک "تصاد و جودی" سے افت میں ہے اور اس بات کو سمجھا جا سکتا ہے کہ کس طرح جب انسان ہٹلے سے زیادہ خود آگاہ ہو جاتا ہے تو آسائش کی طرف اس کا رجحان و میلان روزمرہ معمولات، زندگی کی لذت، خوش بختی کے سکون و آرام اور سیری اور شکم پری سے راضی ہونے کی عادت پکڑنے کو ترک کر دیتا ہے اور نالاں و پر شکایت زندگی بیوں پر ایک بانسری بن جاتی ہے، اپنے خالی وجود سے آگاہ، اس کی ہستی یہاں رہنے کا غم، پر دلیسی ہونے کا درد ناک نالہ اور خوفی راہ کو طے کرنے کا عشق جو اس کے نیستان (بانس کے جنگل) سے جا ملتا ہے (بن جاتی ہے)۔ فلسفہ آگھی کی اہتا پر جا کر تہنائی کو بخخ جاتا ہے۔ جدید فلسفہ موجودت کو دیکھتے مگر عرفانی خود آگھی جدانی کی بحث کرتا ہے "تہنائی بے کسی ہے" اور فطری بات ہے کہ اس بجلہ آدمی "یاس" کو بخچتا ہے اور یہاں عشق کو۔

اب ہم یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ وہ آہ سینہ، سوز بھری جس کے متعلق اقبال گفتگو کرتے ہیں وہ کیا ہے اور کیوں؟

اس مقام پر علم اور عشق دو جہان شہاسی کے طور پر اور بنیادی طور پر انسان

اور جہان کے درمیان دو متقابلہ اطبیعی زیر بحث آتے ہیں ۔ ہر ایک ایسی خصوصیات کے ساتھ جو دوسرے سے ممتاز ہے ۔

علم مقام صفات ، عشق تماشائے ذات  
علم ہے پیدا سوال ، عشق ہے پہنان جواب  
عشق کے ادنیٰ غلام صاحب تاج و ٹگین  
شورش طوفان حال لذت ساحل حرام

عشق کی گری سے ہے مزركہ کائنات  
علم سکون (وثبات) عشق حیات و ممات  
عشق کے، بین مجرمات سلطنت و فقر و دین  
شرع محبت میں عشرت منزل حرام

جو کچھ اب تک ثابت ہوا ہے وہ یہ ہے کہ مغربی فلسفوں میں رائج ذہنی سانچے اور اصطلاحات مثلاً تصوریت ، حقیقت پسندی ، مادیت ، معروضیت ، موضوعیت ، فلسفہ موجودیت ، فلسفہ مرکزیت انسان ، خدا پرستی ، دھرمیت ، فطریت ان میں سے کسی ایک کا بھی روحانی جہان شناسی میں کوئی مطلب و معانی نہیں ہو سکتا اور یہ کسی شے کو بیان نہیں کرتے ۔ اگر ہم یہ چاہیں کہ اس عام روش کے مطابق جو مغرب نے ہم پر مسلط کی ہے ، اس جہان بینی کو ان ذہنوں ڈھانچوں میں سے ایک ڈھانچہ کے سینگ اور خشک چوکھے میں سودیں ، تو ہم حقیقت کے ساتھ خیانت کے مرٹک ہوں گے ، کیونکہ اس کو سونے کے لئے ہمیں چاہیے ناچار اس کے کچھ حصوں کو کاٹ ڈالیں اور سخ کر دیں ، اس جہان بینی کی سب سے زیادہ بنیادی خصوصیت اس کا "بے ڈھانچہ" ہوتا ہے اور یہ انسان اور دنیا کی حقیقت کی بنیادی صفت ہے ۔ لہذا یہ اس انسانی جہان بینی کی حقانیت کی ایک نشانی ہے ۔

درد اور عشق کے علاوہ اس جہان شناسی کا تیسرا اصول عصر عمل ہے اور

قدرتی امر ہے، کیونکہ درد اور عشق، امن اور سالمت کے ہمراہ زندگی گزار سکتے ہیں نیز قدرتی امر ہے کہ عمل اس خون آلودہ بنیاد آنکھ کی پنیرائی میں اس سے کہیں عین غنی اور بلند معنی رکھتا ہے کہ اپنے مغربی مترادف کے حقوق، جامد اور حقوقیں جگہ میں سما سکے۔ مغربی ثقافت میں عمل ایک مشینی، میکانی اور مصلحتی مفہوم رکھتا ہے جو چالاک ہوش کے مکر سے پیدا ہوا، اور خدمت اور فائدہ اٹھانے کے لئے وہ شے ہے جو مادی تقدیر کی تقویت اور جعلی زندگی کے ترقی میں کام آتا ہے مگر یہ انسان کے درد کی دو انبیاء اور وجودی رفعت کی دگر گونی میں کوئی کردار ادا نہیں کرتا۔

اب دیکھئے کہ علامہ اقبال عمل سے کیا مراد یتیہ ہیں؟

انجام خودی ہے بے صبوری ہے فلسفہ وزندگی سے دوری  
افکار کے لغہ ہائے بے صوت میں ذوق عمل کے واسطے موت  
دین سر محمد و بر احیم دین مسلک زندگی کی تقویم  
دل در سخن محمدی بند اے پور علی زیو علی چند

ہم ایک خونی اور شعلہ در جہان شہاسی کے مقابلہ شہرے ہیں ذوق عملی  
ایک آتشی اور انقلابی عمل کی بات ہے، عمل جو درد اشتعال عشق کے پھٹ پڑنے  
سے جنم لیتا ہے اس طرح سے ہے کہ علامہ اقبال عمل کی ایسی تعمیر پیش کر سکتے ہیں  
جو مارکسی لوگوں کے لئے جو عمل کو یا متوسط مکتبہ صنعتیات یا اقتصاد پرستی اور اس  
کے فلسفیات عروج کی صورت میں امریکی عملیت میں سمجھتے ہیں سخت حریت انگریز ہے،  
سقی کردار کے اس میخانے میں کردار کی مستقیم بخش شراب کو کون پیتا ہے؟

مجاہد!

صوفی کی طریقت میں فقط مستنی افکار  
شاعر کی نوادرہ و افسرہ و بے ذوق  
افکار میں سرست ، نہ خوابیدہ نہ بیدار  
وہ صد جمایہ نظر آتا نہیں بھج کو

جی ہاں "مستنی احوال" ، "مستنی گفتار" ، مستنی افکار اور آخر میں "مستنی کردار"۔  
روشن فکروں کے چار واضح اور مشخص گروہ ، چار قسم کی متفاوت جہاں شناسی کے ہمراہ  
ہیں۔ صوفی ، ملا ، فنکار اور مجاہد۔

اس جگہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر فلسفی ہماں ہے؟

بے شک اقبال کا جواب یہ ہے فلسفی بینایی طور پر مست نہیں ہے ہم اس  
جهاں شناسی میں "درو" ، "عشق" اور "عمل" کے مابین منطبق رابطے کو واضح طور پر پا  
لیتے ہیں نیز اس سے واضح تریہ ہے کہ ہم جان لیتے ہیں کہ یہ تین کلام کے وضع شدہ  
اصول یا فلسفی کے ذہن کی مصلحتی مصنوعات کی قسم سے نہیں جو جہاں شناسی کے جدا  
نہ ہونے والی ذاتی خصائص و خصائص اور وجودی پہلوؤں اور فطرتی خصوصیات ہیں۔

اس جہاں شناسی کے درست اور براہ راست اور اک کے لئے جسے علامہ اقبال  
اور آتشیں ، خونی معنی یا ب ، حسن شناس ، پر شکوہ حیدری قوت والی بینائی سے تعمیر  
کرتے ہیں اقبال کی زبان سے واقف ہونا چاہیے۔ اقبال اس کو دینی جہاں شناسی کا  
نام دیتے ہیں مگر یہ دینی صفت ہمارے لئے کس مفہوم کو القاء کرتی ہے ، اگر ہم اس  
چیز کو جسے مذہبی عوام اور غیر مذہبی یا مذہب کے مخالف عام روشن خیال دین کا حصہ

سمجھتے ہیں۔ مان لیں، تو ہم نے نہ صرف اقبال کی بات کو نہیں سمجھا ہے بلکہ اس کا وہ بدترین گھٹیا، انحطاطی مفہوم جو ممکن ہے لیا ہے، بلکہ اس کے بر عکس مفہوم کو لیا ہے، نہ صرف غلط فہمی ہے بلکہ نفس غرض ہے کیونکہ آج دو بازو یا گروہ جنہوں نے مذہبی مومنین اور مذہب کے مخالف روشن خیال لوگ کا نام پایا ہے۔ باوجود اس کے کہ آپس میں شدید تضاد اور فکری تعصب اور یہاں تک کہ علمی تعصب رکھتے ہیں، فکری تعظیم نظر سے، وہ بھی مذہبی فکر کے لحاظ سے آپس میں ہم خیال ہیں یعنی دونوں مذہب کو اور تمام عقاید و حکام مذہب کو ایک یہ طرح سمجھتے ہیں، دونوں ہشت اور دوزخ کو جزا اور سزا، انہی معنوں میں لگشناور گھن (آلش خاد) سمجھتے ہیں، دونوں تخلیق "آدم" کو اسلام کی زبان میں اسی ابوالبشری صورت میں سمجھتے ہیں کہ خدا نے لپٹنے ہاتھ سے مٹی کے صورت میں مجسمہ بنایا اور اس کے بعد اس میں پھونک مارے اور وہ زندہ ہوا، اور پھر اس نے کہا یہوی چاہتا ہوں، اور خدا نے اس کی بائیں پسلی سے ایک لکڑا جدا کر دیا اور اس سے حوا کو بنادیا اور اس کے بعد انہوں نے گیوں کھا یا اور جنت سے خارج کر دیے گئے۔

ہمیں چلہیے کہ نہ (ملاکی) دین داری کا فریب کھائیں اور نہ روشن خیال شخص کے تمدن کا فریب کھائیں۔ ان دونوں کو چھوڑ دین اور تیسری نگاہ سے (دنی ماذک) متن کو پڑھیں جو دل کی تربیت کرتا ہے اور آدمی کو گھرائی بے نیازی، حسن، وجودی، عظمت اور بلندی بخشتا ہے خودی کے بیچ کو جو دنیا کی کپڑے نہ زندگی کی سیاہ کچڑ میں پوشیدہ ہے۔ بہچان لیں، آئیں، اسے باہر لائیں اور صاف کریں اور شاعروں کی انگلیوں کی لطیف زندگی بخش پوروں کی لس و مہربانی کے نیچے انہیں

## پروان چرمھائیں ①

خاموش قبرستان کی مٹی اپنی دنیا اور زندگی کے سرد اور تاریک شبستان کو اس چمک اور گرمی سے گرم اور روشن کریں اور دیکھیں اور جان لیں کہ اس عالم کے خاک کا ہر ایک ذرہ ایک بے قرار لفظ ہے اور معانی کا چشم انتظار اور ہم تو اس آفتاب کے غلام ہیں۔

علامہ اقبال اس خاص جہاں شہی کو جس کی ذات کے اندر حسن زیبائی و شکوه ہے اور درود و عشق و عمل اس کے قدرتی خصائص اور اس کی جو ہری تراویثات کو دینی جہاں شہی کا نام دیتے ہیں اور اس طریقے سے چاہتے ہیں کہ اسے "فلسفی جہاں شہی" اور "صوفیانہ جہاں شہی" اور "شاعرانہ جہاں شہی" (رومی) سے جدا، اور مشخص کریں جس شے کو وہ فلسفیانہ جہاں شہی کہتے ہیں۔ وہ قدر نادی جہاں شہی کو لپٹنے اندر رکھتی ہے، جتنا کہ تصوری جہاں شہی کو رکھتی ہے اور بیک وقت انہیں اس بات کا بڑا ہم ہے کہ ان کے خداوند متعال پر جو بھروسہ وہ رکھتے ہیں اور عرفان کی طرح کی زبان جو وہ استعمال کرتے ہیں ان کے سبب کہیں ان کے فکری مکتب کو "مذہب ملا" یا "مشرق صوفی" سے مشتبہ کر لیں۔ کیونکہ اس کے باوجود کہ

۱۔ سورہ "شہر" ہے۔ قسم ہے آفتاب اور اس کی شہاون کی، نفس کی اور جو چیز اسے سیدھا مالاں پس فوراً در تقوی کو اسے الہام کر دیا اور جس کسی نے اسے (نفس آدمی کی خودی کو) آراستہ اور صاف کیا اس نے فائدہ اٹھایا اور جس نے اسے مذکون اور محبوب کیا اور آزاد ہوا اور سورج کی روشنی سے محروم رکھا ہے۔ بہرہ ہو گیا اور ناکام رہ گیا۔ ملاحظہ ہو۔ "خود سازی انتقالی" میں ۱۱ اور "پاٹھاب

حای آشنا" میں ۱۵۶ اسے۔

سمت ، پیش رفت (ارتنا) ، روح فطرت ، دنیا کا ارادہ آگاہ ، کائنات کے نظام کا سورج ، کعبہ طواف موجودات ، تمام نہایوں کی ذات ، تمام نمائشوں کا وجود ، تمام شہادتوں کا خیب ، حرکات کے قانونی ہونے کی علت ، امور کا محتقول و منطقی و علی ہونا ، اصول تغیرات کا ثابت رہنا ، مظاہر اور واقعات کی وحدت ، رشتہ ، ایک دوسرے سے جو ہونا اور ہم آہنگی ، حادث اور عیش کا ناممکن ہونا ، ہر حقیقت ہر واقعہ اور ہر صفت کی واضح سمت اور مقرر ہیمانہ اور ان کا ہدف رکھنا ، دنیا میں ہے اور آخر میں " ہونے کے معنی " موجودات کا جو ہر " ، فطرت کا فصیر " ، " نفوس کی میں " ، " جان جہاں " اور اقبال کی تعمیر کے مطابق " عالم وجود کی خودی " خدا ہے "۔

خدا کو اس طرح سے پالیتے کے معنی میں جہاں کو اس طرح خدا کو دیکھنا اور سمجھنا جیسے کہ فلسفیات مادیت اور فلسفیات تصورات اس کو سمجھتے ہیں اور نیزہ اس طرح جیسے مستکم اہل قال اسے ثابت کرتے ہیں اور اہل حال صوفی اس کو محسوس کرتے ہیں اور یا بنیادی طور پر ان کا خدا کی اس طرح کی دریافت کے بیچے جہاں کی ایک اور شاخت ہے ایسی شاخت جو علم طبیعت ، علم کیمیا ، علم طبقات الارض اور علم ہندسہ کی سرحد کی سطح پر نہیں رہتی اور مظاہر کی تفسیر اور ان کے تعلقات اور صفات کی توجیہ پر تقاضت نہیں کرتی اور ارادہ رکھتی ہے کہ خیب سے سراہجارتے اور وجود کے راز کو پالے ، اور اس جاری دریا اور واوی حریت و پر شوکت کے دور اور مخفی سرپرستے تک پہنچ جائے اور حقیقت ، کے نقش پا کو " ابدیت " کے عین سحر کے دل تک لے جائے اور " فطرت کی خودی " سے واقف اور " دنیا کی خودی " سے بے تکلف ہو جائے اور ان سب کے باوجود نہ صرف فطرت خاکی کی تکنیک یا تحریر نہیں کرتی

اور فطری مظاہر کو تفہرانداز نہیں کرتی، بلکہ ساتھی قوانین کو حفیر نہیں سمجھتی۔  
 ہرچند کہ یو تاریخی یا تاریخ اسلام میں قدیم مغرب زدگی جس نے فلسفیوں  
 کو، مشرق زدگی جس نے صوفیاں کو اور مسیحیت زدگی جس نے زاہدوں کو بنایا اس  
 نے "خدا بین فطرت کی طرف رجحان" اور انسان کی طرف مائل کمال طلب حقیقت  
 بینی کو جو قرآنی جہاں شہادی اور اسلامی انسان شہادی کی امتیازی علامت تھی، ہمارے  
 فہم و اوراؤک کی گہرائی تفکر اور قدری نظام اور اخلاقی بنیاد میں نہوذ پیدا نہیں کرنے  
 دیا اور ہر ایک نے خود کو لپیٹنے کے راجح اور جانے بہچانے مکاسب کے حوالے  
 کر دیا۔ نتیجہ کیا ہوا؟ اسلامی معاشرے اسلامی فریضہ سے جو خدا کا پانا اور فطرت کی  
 شاخت کرنا اور رسول اللہ کے نمونہ کے سامنے رکھتے ہوئے مثالی امت کا بنانا تھا،  
 بالکل محروم رہ گئے اور اس سے کلی طور پر یہ کام رہے۔ دینی جہاں بینی سے اقبال کا  
 مقصد اسلامی معاشروں کو اس نسب الحین سے واقف کرنا ہے۔

○○○○○○○